دردہ نور خواجہ

بنامِ جنابِ خالد

مدح و ثناء سے اُنؐ کی
مصرع مصرع سحر انگیز ہُوا
جہاں ذہن رسا بھی عاجز ہی سدا رہتا ہے
تیرا اُس بلند معیار تک پہنچنا ہی مقدّر ٹھہرا
ڈوب کر اُس میں نہ اُبھرے کوئی
عشقِ نبیؐ کا ہے جو سمندر گہرا
وابستگیٔ دربارِ رسالت ہو مبارک تجھ کو
حضرت حسانؓ و کعبؓ ہوتے تو صحیح دیتے داد
نعتِ نبی کا ہے بھلا مجھ میں کہاں درک و شعور
صدقے اس نام کے باقی رہے تیرا بھی نام
نام سے جن کے جہاں کا ہے خرابہ آباد
پایا جس نام سے خالق نے بھی لطف و سرور
لیکن اتنا ضرور کہتی ہوں
جب بھی میں "فارقلیط" پڑھتی ہوں۔
دل مسرّت کے نغمے گاتا ہے!

خیال کو نئی تازگی نصیب ہوتی ہے۔
اعلیٰ و ارفع جذبات جاگ اُٹھتے ہیں۔
عشق کی تابندگی پہ یقین آتا ہے،
ایسے میں لب پہ دُعا یہ آتی ہے،
عنایت رب اعلیٰ سے سدا
نغمہ خواں میرے نبیؐ کا رہے تا حشر عزیز!

شخصیّت

ڈاکٹر عبدالسلام خورشید

ذکر اس پری وش کا

عبدالعزیز خالد سے میری آشنائی چھبیس ستائیس سال پرانی ہے۔ پہلے غائبانہ پھر بالمشافہ۔ میں بے روزگاری کے زمانے میں فری لانس جرنلزم کرتا تھا۔ اس میں رسالہ "کتاب" کی ادارت بھی شامل تھی۔ خالد نے اپنا کلام بھیجا تو میں بہت متاثر ہوا۔ ایک کلام کی شائستگی سے اور شگفتگی سے، دوسرے حسنِ تحریر سے، جو لوگ خوش خط ہوتے ہیں ان سے مجھے ایک گونہ دل بستگی ہو جاتی ہے چنانچہ میں وقتاً فوقتاً ان سے کلام بھیجنے کی فرمائش کرتا رہا۔ ایک دفعہ کراچی گیا تو اپنے پرانے دوست اور پروفیسر سید عبدالقادر مرحوم کے داماد جناب ذکریا ساجد کے ہاں ٹھہرا۔ وہ خالد کے ہم جماعت رہے تھے۔ انہوں نے کہا تمھیں عبدالعزیز خالد سے ملاؤں گا۔ ان کی شخصیت بہت دلآویز ہے۔ چنانچہ ایک دن ہم دونوں ان کے گھر گئے لیکن ابھی قدرت کو ملاقات منظور نہیں تھا کیونکہ وہ کہیں گئے ہوئے تھے۔ ان دنوں وہ پاکستان رائٹرز گلڈ کے خزانچی تھے۔ ایک دن میرے جی میں کیا آئی کہ اپنا ایک نجی مسئلہ انھیں لکھ بھیجا اور مدد کا طلب گار ہوا اور انہوں نے بھی صورت شناسی اور ملاقات کے بغیر شرفِ پذیرائی بخشا جس سے میں بہت متاثر ہوا۔ کچھ عرصہ بعد مولانا کوثر نیازی نے لاہور میں پہلی مرتبہ خالد کے اعزاز میں ایک جلسے کا اہتمام کیا اور مجھے حکم دیا کہ خالد کی شاعری کے کسی پہلو پر مقالہ پڑھوں۔ میں نے اس پیشکش کو ایک نعمتِ غیر مترقبہ جانا کہ اچھے لوگوں کی تحسین کارِ ثواب کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس سے پہلے ان کی کتابوں کا ایک بنڈل مل چکا تھا اور میں متحیر تھا کہ اس شخص میں کتنی "انرجی" ہے کہ اتنے تھوڑے عرصے میں اتنی کتابیں لکھ ڈالی ہیں لیکن میری ایک بڑی دقت ہمیشہ سے یہ رہی ہے کہ اردو کے ہندو شعراء اور اردو ڈرامے کے ارتقاء پر کتابیں لکھنے کے باوجود کبھی نقاد یا ادیب کہلانے کا زعم نہیں ہوا اور کسی کی شاعری پر لکھنے سے تو کنی کترا جاتا ہوں کیونکہ میں اپنے آپ کو اس کا اہل نہیں سمجھتا۔ بہرحال اپنی محدود سمجھ بوجھ کے مطابق ایک مقالہ لکھا اور اس محفل میں پڑھ دیا اور یہاں سے بالمشافہ ملاقات کا سلسلہ شروع ہوا لیکن اصل تعلقات تب شروع ہوئے جب وہ لاہور آئے۔ پے در پے ملاقاتیں ہوئیں۔ رفتہ رفتہ ان کے ذاتی جوہر کھلے اور ان کی بعض ادائیں اتنی پسند آئیں کہ میں نے ان کا دامن مضبوطی سے پکڑ لیا کہ ایسے اچھے انسان دنیا میں کم ملتے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ یہ شخص کسی کی برائی نہیں کرتا حالانکہ شاعری کی دنیا میں رقابتیں عام چلتی ہیں اور شعراء

ایک دوسرے کو گُگنی مارنے میں کمال رکھتے ہیں۔ خالد سے جس کا ذکر سنا تعریف کے انداز میں سُنا حتیٰ کہ جب انھیں میرا کوئی کالم پسند آیا اُنھوں نے فون کر دیا اور تعریف کے اتنے پُل باندھے کہ میں حجاب آلود ہو گیا کیونکہ میں اپنی تحریر کی تعریف پر خوش تو قدرتی طور پر ہوتا ہوں لیکن گھبرا بھی جاتا ہوں۔ ایک بار میں نے ان سے کہا کہ آپ سب کی تعریف کرتے ہیں کسی کی بُرائی نہیں کرتے تو کہنے لگے "میرے نزدیک کسی کی تحریر کی تعریف ایک احسن بات ہے کیونکہ اس شخص کا حوصلہ بڑھتا ہے اور وہ بہتر تخلیق کی طرف مائل ہو جاتا ہے" اور اگر دوسرے لوگ بھی ایسا کریں تو اس سے علم و ادب کو فروغ ہو گا اور یہی ہر دانش ور کا مدّعا ہونا چاہیئے۔

خالد بہت ملنسار ہیں۔ پہلے انھی نے میرے ہاں آنا شروع کیا اور اس مغربی روایت کو کبھی پیشِ نظر نہ رکھا کہ ایک شخص کسی کے ہاں جائے تو پھر اس کے ہاں آئے۔ اور اس طرح Return visits کا سلسلہ چلے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ میں نے بھی بے تکلفی سے ملنا شروع کر دیا اور کبھی یہ نہیں سوچا کہ میں ان کے جاتا ہوں وہ میرے ہاں کم آتے ہیں گویا ایک ایسی دوستی ہو گئی جو رسمیات سے آزاد ہے اور جو حقیقت میں ایک خاندانی دوستی کا رُوپ بھی لے چکی ہے۔

ہر انسان کی طرح خالد بھی ایک حساس شخصیت کا مالک ہے۔ میں نے جب اس کی کسی کتاب پر تبصرہ کیا یا اس پر مقالہ لکھا یا اس کا تذکرہ اپنے کالم میں کیا یا اس سے گفتگو کی۔ اسے بہت مشکل پسند قرار دیا اور تعریف کے ساتھ ساتھ یہ بھی لکھا اور کہا کہ ہر تحریر کا بنیادی مقصد ابلاغ ہوتا ہے۔ ابلاغ کے لیے زبان کی سادگی ضروری ہے اور قاری سے یہ توقع نہیں رکھنی چاہیئے کہ وہ شعر کا مطلب سمجھنے کے لیے لغت کا سہارا لے لیکن خالد نے کبھی اس نکتہ چینی سے کوئی غلط یا نامطلوب تاثر نہ لیا بلکہ میرا خیال ہے کہ اس نے میرے نقطۂ نگاہ کو سمجھنے کی کوشش کی چنانچہ رفتہ رفتہ اس کے کلام کا یہ پہلو نکتہ چینی سے آزاد ہوتا چلا گیا اور اب اس کا کلام نسبتاً آزاد زبان کا حامل ہوتا ہے۔ میں نے بار بار یہ بھی کہا کہ میں نہ خود شاعر ہوں نہ شعر کا نقاد۔ جس شعر سے ماضی کی کسی وارداتِ قلبی کی یاد تازہ ہو جائے یا کوئی بھولی بسری بات یاد آ جائے میرے نزدیک وہی شعر قابلِ تعریف ہے اور میں نے یہ بھی کہا کہ عین ممکن ہے کہ مشکل پسندی پر نکتہ چینی میری جہالت کا نتیجہ ہو۔ یاد رہے کہ جہالت کا لفظ کوئی گالی نہیں۔ عربی کا سیدھا سادا لفظ ہے جس کا مطلب ہے بے خبری۔ یہاں مولانا غلام رسول مہر یاد آ گئے۔ جب اُنھوں نے پہلی بیوی کے انتقال کے چند سال بعد آج سے کوئی چالیس پینتالیس سال پہلے نکاحِ ثانی فرمایا تو ابتدائی سالوں میں کہیں بیوی کو جاہل کہہ دیا۔ وہ بے چاری رونے لگی۔ اس پر مہر صاحب نے کمال معصومیت کے ساتھ کہا۔ مولانا: (یہ ان کا پیار کا لفظ تھا) میں نے آپ کو جاہل کہا تو محض عربی کا ایک لفظ استعمال کیا جس کا مطلب ہے بے خبر! بھلا اس میں اعتراض کی کیا گنجائش ہے؟

خالد کی زندگی میں بلا کی باقاعدگی ہے۔ وہ ان افسروں میں بھی شامل نہیں ہیں، جو

دیر سے دفتر میں آنے کو قابلِ فخر قرار دیتے ہیں۔ وہ دفتر میں وقت پر آتے ہیں چنانچہ ایسا کبھی نہیں ہُوا کہ دفتر کے اوقات میں انہیں فون کیا ہو اور وہ موجود نہ ہوں۔ یہ ادا میں نے حکومتِ پنجاب کے انفرمیشن سیکرٹری جناب حفیظ الرحمٰن میں بھی پائی ہے۔ خالد کی دفتری زندگی کا دوسرا حسین پہلو یہ ہے کہ ملاقاتیوں کے لیے دروازہ ہمیشہ کھلا رہتا ہے اور وزٹنگ کارڈ یا چٹ بھیجنے کی ضرورت کبھی نہیں پڑتی اور پھر کافی کا جو مزہ ان کے دفتر میں آتا ہے وہ کسی اور جگہ نہیں آتا۔ اس سے یہ مطلب اخذ نہ کیجئے کہ وہ دفتری کام سے اغماض برتتے ہیں۔ دفتری کام ساتھ ساتھ چلتے ہیں اور دفتری ملاقاتیں بھی۔ اور فرائض منصبی میں انصاف بلکہ فراخدلانہ انصاف سے کام لیتے ہیں۔ اس لیے ایک افسر کی حیثیت سے بھی ان کی شہرت بہت اچھّی ہے ورنہ آپ لاہور کے شہریوں کو جانتے ہی ہیں۔ یہ لوگ کسی کو خاطر میں نہیں لاتے اور اچھے اچھّوں کو بدنام کر دیتے ہیں۔ ایک بار میں نے خالد سے کہا مجھے آپ پر رشک آتا ہے۔ پوچھنے لگے کس لیے؟ میں نے کہا جو ذکر کرتا ہے کم بخت تعریف ہی کرتا ہے۔ آخر آپ کے پاس جادو کی کون سی چھڑی موجود ہے جس سے لوگوں کو متاثّر کر لیتے ہیں؟

خالد سے پیار کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان کا کتب خانہ علم و ادب کا ایک بہت بڑا ذخیرہ ہے لیکن میں نے کبھی کوئی کتاب مانگی نہیں اس لیے کہ ایک پُرانے استاد کا یہ مقولہ یاد ہے کہ جو شخص کسی کو کتاب مستعار دیتا ہے وہ بیوقوف ہوتا ہے اور جو کتاب واپس کر دیتا ہے وہ اس سے بھی بڑا بیوقوف ہے اور میں نہیں چاہتا کہ ہم میں سے کوئی بھی بے وقوف ثابت ہو۔ وہ کہتے ہیں کہ میں ہمیشہ دارالمطالعہ میں فرش پر سوتا ہوں۔ چارپائی پر نہیں سوتا مجھے اس بات کا یقین نہیں آتا اور چونکہ میں مُنہ پھٹ ہوں اس لیے ایک بار پوچھ بیٹھا تو پھر بچّے کیسے ہو گئے؟

ع تبسّمے بہ لب آورسید و ہیچ نگفت

وہ سیر بھی کرتے ہیں "یوگا" کے بھی قائل ہیں۔ رات کا کھانا بھی نہیں کھاتے۔ اگرچہ ایک بار ہوٹل میں کھانا کھلانے کے ساتھ ساتھ کھاتے بھی دیکھ لیا تھا۔ گھریلو فرائض بھی ادا کرتے ہیں۔ فرائضِ منصبی میں بھی طاق ہیں، مطالعہ بھی بے پناہ کرتے ہیں اور شعر تو اتنے کہتے ہیں، اتنے کہتے ہیں کہ شاید ہی کلام کے اتنے مجموعے کسی اور شاعر نے پیش کیے ہوں۔ مختلف زبانوں پر بھی عبور حاصل ہے۔ غیر ملکی اَدب کا مطالعہ بھی کرتے ہیں۔ خدا جانے جنّ ہیں کہ انسان۔ بہرحال اللہ تعالیٰ انہیں نظرِ بد سے بچائے۔ یہ سب زندگی میں باقاعدگی کے کرشمے ہیں۔

خالد کے بعض مدّاح انھیں صوفی بتاتے ہیں۔ میں نہیں مانتا کیونکہ صوفی لوگوں میں تو یبوست ہوتی ہے اور خالد اس چیز سے عاری ہے۔ بھلا جو شخص سیفو اور سلومی کا خالق ہو اس سے یبوست کون منسوب کر سکتا ہے؟ جنسیات سے انھیں کوئی خوف نہیں آتا حسن پسند ہیں کیونکہ جمالیاتی ذوق ان کی ہر چیز سے نظر آتا ہے، لباس سے، رہن سہن سے، ڈرائنگ روم کی آرائش سے اور سب سے بڑھ کر کلام سے۔ پچھلے دنوں "دشتِ شام" کے دوسرے

ایڈیشن کا مطالعہ کر رہا تھا تو چند شعر بہت پسند آئے۔ آپ بھی سُن لیجئے۔

ترا جمالِ خدا داد ہو بیاں کیونکر
زبان کی آنکھ نہیں، آنکھ کی زبان نہیں

— بدن لباس میں جیسے شراب شیشے میں
سوال مجھ سے نہ کر ماتُرِیدُ مِنّی کا

— اکیلی سیج پہ برہن کو کیسے نیند آئے
کہاں ہے چاہنے والا، جو اس کے لہکیلے
رنگیلے رُوپ، رسیلے بدن کو سہلائے

— تمہارے جسم سے بوئے محبت آتی ہے
برہنہ شانوں کو چوموں لرزتے ہونٹوں سے

— میری گرفت سے خود کو چھڑا کے کہنے لگی!
تمہارے شر سے بچائے خدائے پاک مجھے

— کریں گے پھر کبھی رازو نیاز کی باتیں
کیا تھا فون فقط دفع بوریت کے لیے

— آنکھ میں آگ، سانس بے قابو
عنفوانِ شباب کا نقشہ

— سہی قامت، گداز، لچکیلی
رنگ جیسے انار کا دانہ

کبھی فرصت ملی تو خالد کی شاعری میں جنس کے پہلو پر لکھوں گا کیونکہ جہاں اس نے شاعری کی دوسری روایتوں سے بغاوت کی ہے وہاں جنس کے پُرانے تصوّر کو بھی خیرباد کہہ کر طرحِ نو ڈالی ہے۔ اور ہاں یہ مختصر نظم بھی میں نے نوٹ کر لکھی ہے۔

اس انتظار میں
کہ خواب میں

تم آؤ گی

میں ساری رات جاگتا رہا۔

ویسے ہماری ان باتوں سے کوئی غلط مطلب اخذ نہ کر لیجئے گا۔ خالد ایک نیک انسان ہے۔ ایک اچھا شوہر، ایک اچھا باپ، ایک اچھا دوست، ایک اچھا ہم نشیں ہے

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیئے!

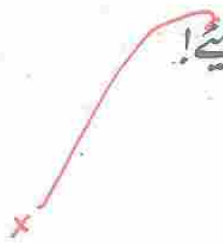

رحیم گُل

خدّوخال

بڑا افسر ۔ ۔ ۔ ۔ انکم ٹیکس کمشنر، بڑا شاعر ۔ ۔ ۔ ۔ نام عبدالعزیز خالد

خوبصورت آدمی، ذہنی طور پر بھی جسمانی طور پر بھی،

باریک آواز میں تیز تر بلکہ تیز ترین بولنے والا ۔

الفاظ ہاتھ میں ہاتھ ڈالے اس طرح ان کی زبان سے نکلتے ہیں جیسے مشین گن سے گولیاں نکل رہی ہوں ۔

کبھی کبھی مس فائر بھی ہوجاتا ہے تو مضطربانہ کیفیت میں آنکھیں جھپکتے ہیں اعصابی گرفت سے نکلتے ہیں تو پھر سے زوردار فائرنگ شروع ہوجاتی ہے ان گنت کتابوں کے مصنف ہیں ۔ تعداد میں شاید اشتیاق احمد کی کتابیں ہی زیادہ ہوں ۔ اشتیاق احمد بچوں کے لئے لکھتے ہیں ، عبدالعزیز خالد بالغوں کے لئے لکھتے ہیں بلکہ بالغ نظروں کے لئے لکھتے ہیں ۔

ہم جیسے تو ان کے قافیہ ردیف دیکھ کر بے ہوش ہو جاتے ہیں ! اس کے باوجود وہ بڑا شاعر ہے لوگ انہیں مانتے ہیں نقاد انہیں تسلیم کرتے ہیں ان کی علمیت مسلمہ، ان کی صلاحیتیں بے پناہ اور ان کی اہلیت کے سب قائل ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

وہ فطری تخلیق کار ہیں ان کا شعری سرمایہ ملک کے ہر شاعر سے زیادہ (حفیظ جالندھری کے لیے لمحۂ فکریہ)

اپنی چھپی ہوئی کتاب شاید ہی کسی کو دیتے ہوں لیکن دوسروں کی ہر نئی چھپنے والی کتاب تقاضا کر کے حاصل کرتے ہیں بلکہ چھیننے کی حد تک اصرار کرتے ہیں مگر چھیننے کے انداز میں محبت کی مہک ہوتی ہے اور تقاضا کرنے میں قربت کا احساس ہوتا ہے ۔ ۔

بڑے افسر ہیں مگر شاعرانہ تمکنت نے افسرانہ رعونت کو دبا دیا ہے شاید یہی وجہ ہے کہ اجلے اجلے چہرے اور روشن روشن پیشانی کے امتزاج سے ایک متین آدمی نے جنم لیا ہے ۔

انسان سے محبت کرتا ہے شعروادب سے تعلق رکھنے والوں سے کچھ زیادہ ہی محبت کرتا ہے ۔

نیک نیت آدمی ہے ۔

نیک نام افسر ہے ۔ ظاہر ہے ماتحت انہیں پسند کرتے ہوں گے ۔ ہمارے معاشرے میں جو آدمی زمانے کے ساتھ نہ چلے احمقانہ اکثریت کی پرواہ نہ کرے تو اس کو مس فٹ بلکہ بیک ورڈ کہا جاتا ہے ۔

ہمارے ایک دوست ہیں وہ جناب احمد ندیم قاسمی پر الزام لگاتے ہیں کہ شراب نہیں پیتا اس لئے پیچھے رہ گیا ہے۔۔۔

سبحان اللہ!

اگر قاسمی صاحب پیچھے رہ گیا ہے تو پھر آگے کون نکل گیا ہے؟۔

اسی طرح کے دو چار الزام عبدالعزیز خالد پر بھی لاگو ہوتے ہیں کہ شراب نہیں پیتا، رشوت نہیں لیتا، نماز پڑھتا ہے اس لئے پیچھے رہ گیا ہے۔

عجیب بات ہے۔۔ اس معاشرے میں نوری نت، مولا جٹ چھاتی پر دس دس گولیاں کھا کر ہضم کر جاتے ہیں لوگ تالی بجاتے ہیں لیکن خالد جیسے افسر کو خود احتسابی کی داد کے بجائے طعنوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

کہتے ہیں۔۔۔ "ہمت نہیں، حوصلہ نہیں!"

واہ کیا پیمانہ ہے۔۔۔ مجرم یہاں جی دار اور شرافت محض بزدلی!

راشی کو یہاں داد ملے کہ رویہ لچکدار رکھتا ہے دینے والا خوش، کہ نبض شناسِ وقت ہے۔

دس دیتا ہے سو وصولتا ہے۔۔۔۔!!

گویا مفاہمت پسندی یہاں شاہراہ۔۔ اصول پسندی محض پگڈنڈی،

چالاکی، پیار بسیار، سچائی کارِ بے کار،

خود غرضی کارِ عاقلاں، بے غرضی کارِ طفلاں

ریاکاری سزاوارِ تحسین بے ریائی لائقِ تعزیر،

تو پھر طے یوں ہوا۔۔۔ اگر پیچھے رہ جانے میں احمد ندیم قاسمی جیسی قدر و منزلت ملے تو بسم اللہ۔۔ بہت سے لوگ پیچھے رہ جانے میں فخر محسوس کریں گے۔

اور پیچھے رہ جانے میں آدمی کمشنر بن جاتا ہے تو لوگ پیچھے رہ جانے کی دوڑ شروع کر دیں گے۔

تو پھر آئیں پیچھے کی طرف دوڑ لگائیں۔ کچھ بن سکیں گے یا نہیں عبدالعزیز خالد تو بن ہی جائیں گے۔۔!۔

حفیظ صدیقی

عبدالعزیز خالد ایک تاثّر

۱۵ جنوری ۱۹۲۷ء کو ضلع جالندھر کے ایک گاؤں پرجیاں کلاں میں پیدا ہونے والے تیس کے قریب شعری مجموعوں کے خالق اور متعدد تراجم کے پیش کار عبدالعزیز خالد، بلاشبہ اُس عہد کے عظیم شاعر ہی نہیں بلکہ بلند پایہ مفکّر راسخ الفکر عالم، قابلِ رشک حد تک وسیع المطالعہ اور نابغۂ روزگار شخصیت ہیں۔ جو کہ ہر چند معاشیات کے منتہی ہیں۔ تاہم ان کا علمی تبحّر رسمی اسناد سے کہیں زیادہ وسعت اور تعمّق کا حامل ہے۔ وہ اس قدر کثیر الجہات شاعر اور مجموعۂ اوصاف انسان ہیں کہ کسی بھی مختصر تحریر میں ان کا احاطہ کماحقّہٗ نہیں کیا جا سکتا۔ ان پر لاتعداد مضامین لکھے جا چکے ہیں۔ متعدد کتابیں مرتّب ہو چکی ہیں۔ اور خصوصی شمارے وقف کیے جا چکے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اب بھی ان پر بہت کچھ لکھے جانے کی گنجائش باقی ہے۔ اس لیے کہ جب تک ان کے موجودہ کلام پر لکھا جا رہا ہوتا ہے وہ مزید اتنا کچھ لکھ چکے ہوتے ہیں کہ تنقید پیچھے رہ جاتی ہے اور شاعر آگے نکل جاتا ہے۔

اُنھوں نے ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے اور لکھنے کا حق ادا کر دیا ہے۔ ان کی نظمیں ایک قادر الکلام نظم گو کا تاثّر چھوڑتی ہیں۔ تو غزلیں ایک خوش فکر غزل گو کی حیثیت سے ان کا لوہا منواتی ہیں۔ رباعیات و قطعات میں اگر ان کے جوہر کھلتے نظر آتے ہیں تو تمثیلات میں وہ ایک کامیاب ڈرامہ نگار دکھائی دیتے ہیں۔ طبع زاد تخلیقات اگر سچّے اور بڑے شاعر کی حیثیت سے ان کا رتبہ متعیّن کراتی ہیں تو ان کے تراجم ایسے کامیاب مترجم کی حیثیت سے انھیں سامنے لاتے ہیں جو اصل کو اپنی روح میں جذب کر کے ایسے دلپذیر انداز میں پیش کرتا ہے کہ ترجمے پر اصل کا گمان ہونے لگتا ہے۔ اگر رومانی نظمیں ایک خوش فکر رومانی شاعر کے طور پر ان کا تعارف کراتی ہیں تو ان کی نعتیں ایک سچّے عاشقِ رسول کی حیثیت سے انھیں متعارف کراتی ہیں۔ جدا ہونے والے لوگوں کے بارے میں کہیں ہوئی ان کی ذاتی نظمیں اگر بنی نوع انسان سے محبّت کرنے والے انسان کے طور پر انھیں سامنے لاتی ہیں تو ان کی حمدیں ایک سچّے بندۂ خدا کے طور پر ان سے ثنا سائی عطا کرتی ہیں۔ غرض اُنھوں نے جس صنفِ سخن کو بھی اپنایا ہے اس صنفِ سخن کی بارگاہ میں خود کو سرخرو پایا ہے۔

ان کی قادر الکلامی کا عالم یہ ہے کہ جہاں طویل ترین نظمیں لکھی ہیں (جن میں ایک نظم ۱۵۰ اشعار پر مشتمل ہے) وہاں یک مصرعی نظمیں بھی کہی ہیں جن سے جہاں یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شاعر اپنے مذاق، موقعہ اور محل نیز اپنے موضوع کی مناسبت

سے طویل ترین نظمیں کہنے پر قادر ہے۔ وہاں وہ صرف ایک ہی مصرعے میں مافی الضمیر بیان کر لینے کا ہنر بھی جانتا ہے۔

خالد کی شاعری سے انکار کی مجال تو اب تک کسی مخالف کو بھی نہیں ہوئی مگر ان کی زبان پر اعتراض اُنھوں نے بھی کیے ہیں۔ ان کی مشکل گوئی پر سخت سے سخت تنقید بھی ہوئی ہے مگر ان کی شاعرانہ عظمت سے انکار نہیں ہوا۔ ویسے یہ بات اکثر اوقات نظر انداز کر دی جاتی ہے کہ نہایت مشکل کے ساتھ ساتھ اُنھوں نے نہایت سلیس اور آسان زبان میں بھی شاعری کی ہے۔ مگر مشکل نویسی تو ان کے معترض کی توجہ کا مرکز بنی رہی جبکہ آسان نویسی پر اُنھوں نے دھیان نہیں دیا اپنی مشکل گوئی سے وہ خود بھی آگاہ ہیں اور تمام تر تنقید کے باوجود اپنے اندازِ بیان پر قائم ہیں جس کا سبب یہ ہے کہ اُنھوں نے اُردو زبان میں دوسری زبانوں کے الفاظ (جن میں عربی سرِ فہرست ہے) بطور فیشن کے شامل نہیں کیے۔ بلکہ یوں اُردو زبان کے دامن کو وسیع تر کرنے کی سعی ہی کی ہے۔ اور اس تہذیب کو زندہ کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ جس کا سرچشمہ عربی ہے جسے زبانوں کی ماں کہا جاتا ہے اور جس میں ہمارا علمی، ادبی، مذہبی اور ثقافتی ورثہ محفوظ ہے یوں خالد اپنے قارئین کو اصل ماخذ تک رسائی حاصل کرنے کی راہ دکھانے میں مصروف ہیں کہ جڑیں جتنی مضبوط ہوں گی درخت اتنا ہی تناور ہو گا۔ اس پہلو کو ملحوظ رکھا جائے تو خالد کی شاعری، شاعری کے علاوہ ایک ثقافتی عمل بھی ہے اور زبان و ادب کے علاوہ ثقافتی سطح پر بھی قابلِ قدر خدمت ہے۔

بالعموم نابغہ روزگار شخصیتوں اور بڑے شاعروں ادیبوں اور فلسفیوں کی اپنی زندگی غیر منضبط اور بے ترتیب ہوتی ہے۔ جس کے اسباب یا تفاصیل پر بحث کرنے کی یہاں گنجائش نہیں۔ لیکن عبدالعزیز خالد کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ جتنے بڑے نابغہ روزگار شاعر اور مفکر ہیں۔ اتنی ہی ان کی زندگی صاف ستھری اور منضبط رہتی ہے۔ اپنے معمولات میں چاہے وہ ذاتی یا دفتری ہوں حد درجہ پابندی اور اصول پرستی کی قابلِ قدر تقلید اور قابلِ رشک جیتی جاگتی تصویر ہیں۔ سچ ان کا شعار، صاف گوئی ان کا طریق، پابندیٔ عہد ان کی عادتِ ثانیہ اور دوسروں کی دل جوئی ان کے دکھ درد میں شریک ہونا ان کی خواہش اور طلب کرنے پر صحیح اور واضح مشورہ دینا ان کی کمزوری ہے۔ وہ عملاً کچھ نہ کر سکنے کی حیثیت میں ہوں تو بھی ان کا حوصلہ افزائی کا انداز اور دلجوئی کا طرز ایسا مؤثر ہوتا ہے کہ ایک بار تو انسان کے تنِ مردہ میں جان سی آجاتی ہے اور وہ عزم و حوصلہ کے ساتھ آگے بڑھنے کی ہمت محسوس کرنے لگتا ہے۔ ذاتی مسائل کے علاوہ وہ علمی و ادبی سطح پر بھی دوستوں کی بہر طور حوصلہ افزائی کرتے ہیں جو سراسر مؤثر ہوتی ہیں۔ ہر دو صورتوں میں اثر پذیری کا بڑا سبب یہی ہے کہ آواز ان کے دل سے نکلتی ہے۔ دکھاوے اور ریاکاری کے کلمات نہیں ہوتے۔ اور جو بات دل سے نکلتی ہے، اثر بھی کرتی ہے۔

شخصی سطح پر اتنے نکھرے، صاف ستھرے اور بے داغ کردار کے عظیم شاعر کو پیشِ نظر رکھیں تو میر کا یہ شعر یاد آنے لگتا ہے۔

مت سہل ہمیں جانو، پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

عطاء الحق قاسمی

ایک غیر شاعر شاعر

گو عبدالعزیز خالد کے اتنے شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں جتنی ابھی تک میری غزلیں بھی شائع نہیں ہوئیں، مگر اس کے باوجود میں انھیں شاعر نہیں مانتا۔ میری ہی طرح کے کچھ اور لوگ بھی انھیں شاعر نہیں مانتے، مگر ان کے مسائل کچھ اور ہیں، جبکہ میں انھیں اگر طبقۂ شعراء میں شامل نہیں سمجھتا، تو میرے پاس اس کے لیے قدرے مختلف دلائل و براہین موجود ہیں۔ مثلاً میں سمجھتا ہوں کہ شاعر ایسے نہیں ہوتے جیسے اپنے عبدالعزیز خالد ہیں۔ شاعر ہونے کے لیے جن کم سے کم شرائط کا پورا ہونا لازمی ہے ان میں ایک "تلمیذ الرحمٰن" ہونے کی شرط بھی ہے بھلے وقتوں میں تو اس تلمیذ الرحمٰن کے معنی بھی کچھ بھلے سے ہوں گے مگر آج کا اس کا مطلب علم سے کورا ہونا ہے، لکھنے پڑھنے سے الرجک ہونا ہے اور جب کوئی اس اہم فریضے کی طرف توجہ دلائے تو آگے سے ناک بھوں چڑھا کر یہ کہنا ہے کہ صاحب ہمیں پڑھنے لکھنے کی کیا ضرورت ہے ہم تو تلمیذ الرحمٰن ہیں۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ جب اس تلمیذ الرحمٰن سے دو چار بار سابقہ پڑتا ہے، تو پتہ چلتا ہے کہ یہ تلمیذ الرحمٰن دراصل گوالمنڈی کا عبدالرحمٰن ہے۔ سو عبدالعزیز خالد کو اگر میں شاعر نہیں مانتا۔ تو اس کی پہلی وجہ یہی ہے کہ وہ عبدالرحمٰن کیوں نہیں ہیں؛ یہی نہیں انھیں تو جنون کی حد تک مطالعے کا شوق ہے اور نہ صرف یہ کہ ان کی ذاتی کتابوں یا یوں کہہ لیں کہ ان کی "منکوحہ" کتابوں کی تعداد ہزار تک پہنچ چکی ہے، بلکہ وہ دوسروں کی کتابوں پر بھی ہر وقت دندانِ آز تیز رکھتے ہیں اور انھیں اپنے "حرم" میں شامل کرنے کے لیے کوشاں نظر آتے ہیں، چنانچہ کسی کے ہاتھ میں کوئی نئی نویلی کتاب دیکھ کر ان پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور پھر وہ اس کے حصول کے لیے بے چین نظر آنے لگتے ہیں۔ انھیں شاعر نہ ماننے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ ان کا حلیہ اور عادتیں شاعروں جیسی نہیں ہیں۔ چنانچہ انھیں دیکھ کر نہ تو بچے ڈرتے ہیں اور نہ بچوں کی ماں کے دل میں وسوسے پیدا ہوتے ہیں۔ اسی طرح شاعر ہونے کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ وہ دنیاداری کے جھمیلوں میں نہ پڑتا ہو، یعنی اسے اپنے اور بال بچوں کی روزی کمانے کے لیے محنت و مشقت کی عادت نہ ہو، بلکہ اس ضمن میں وہ تین سو غزل ماہوار آمدنی ہی کو کافی سمجھتا ہو۔ بدقسمت سے عبدالعزیز خالد یہ شرط بھی پوری نہیں کرتے، ورنہ میں انھیں رعایتی نمبر دے کر ہی شاعر مان لیتا۔ عبدالعزیز خالد میں ایک چیز ایسی بھی ہے جو اُن کے ہم رتبہ اور اُن کے "ہم رینک" بیشتر فن کاروں میں نہیں پائی جاتی، مگر ان میں موجود ہے اور

یہ بجی خوش خلقی ہے۔ راقم الحروف نے عمرِ عزیز کے کئی برس انھی لوگوں میں بسر کیے ہیں اور یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ جب کوئی ادیب نامور ہو جاتا ہے تو وہ کبھی اندر ہی اندر اور کبھی کھلم کھلا دوسروں کو حقیر کیڑے مکوڑے تصور کرنے لگتا ہے۔ چنانچہ اس قبیلے کے افراد جب نئی نسل کے ادیب کے ساتھ ملتے ہیں تو اس کی تخلیقات سے کماحقہٗ آگاہی کے باوجود پائپ کو دانتوں میں چباتے اور غور و فکر کے لیے آنکھیں موندتے ہوئے کہتے ہیں: "میں نے آپ کا نام کہیں پڑھا ہے۔" یہ سن کر آپ کے تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے اور آپ چپ چاپ وہاں سے اٹھ جاتے ہیں۔ ہمارے ایک بھلے مانس دوست کا کہنا ہے کہ یہ لوگ دوسروں کی تخلیقات سے بے خبری کا یہ انداز "پوز" نہیں کرتے، بلکہ درحقیقت انھوں نے مطالعے جیسی عادت بد پالی ہی نہیں ہوتی! چنانچہ ایسا نہیں کہ یہ صرف دوسروں کی چیزیں نہیں پڑھتے، بلکہ یہ کوشش کے باوجود اپنی تخلیقات بھی نہیں پڑھ سکتے، تاہم اسی طرح کے ایک بڑے افسانہ نگار سے میری بھی ایک بار ملاقات ہوئی تھی۔ اس نے مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے مصنوعی مسکراہٹ چہرے پر بکھیری اور کہا: "آپ کے کچھ کالم و الم میں نے پڑھے ہیں اور آپ کہیں باہر واہر بھی تو گئے تھے۔" میں نے یہ سن کر اثبات میں سر ہلایا اور پھر کچھ وقفے کے بعد اس افسانہ نگار سے کہا: "ایک عرصے سے آپ کی کوئی "غزل" نظر سے نہیں گزری، آپ ایسے شاعر کو اتنی طویل خاموشی اختیار نہیں کرنی چاہیے۔" تاہم عبدالعزیز خالد سے ہم کلام ہوتے وقت اس نوع کے جوابی حملوں کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی، کیونکہ ان سے ملاقات کے وقت مصنوعی مسکراہٹ کے بجائے سچی گرمجوشی میسر آتی ہے اور دوسرے آپ محسوس کرتے ہیں کہ وہ دورانِ گفتگو اپنی برتری ثابت کرنے کے لیے آپ کو کمتر ثابت کرنے کی کوشش میں مشغول نہیں ہیں، بلکہ اس ملاقات کے دوران آپ یہ جان کر حیران ہوں گے کہ ان کی رسائی آپ کے ایک ایک چھپے ہوئے لفظ تک ہو چکی ہے، مگر آپ اپنی جن تحریروں کو بھول بھی چکے ہیں یا بھلانا چاہتے ہیں۔ عبدالعزیز خالد گفتگو میں ان کا حوالہ دینے سے بھی نہیں چوکیں گے؛ چنانچہ وہ آپ کو سنجیدگی سے بتائیں گے کہ "ممتاز عالم جنتری میں آپ کی غزل نظروں سے گزری تھی۔ ماہنامہ چاند کے کچھ پرچے ایک جگہ دیکھنے کا اتفاق ہوا تو آپ کے مزاحیہ مضامین پڑھنے کو ملے۔" "بہت اچھے تھے، بہت اچھے تھے، بہت اچھے تھے۔" یہ "بہت اچھے تھے" کی گردان کتابت کی غلطی نہیں ہے، بلکہ نقل بمطابق اصل ہے، کیونکہ عبدالعزیز خالد گفتگو کے دوران قدرے ہکلاتے ہیں مگر اس کا حل انھوں نے یہ سوچا ہے کہ جس فقرے پر ہکلانے لگیں۔ تو فوراً وہ فقرہ تیزی سے دہرانے لگتے ہیں۔ یوں وہ عام گفتگو بھی بہت تیزی سے کرنے کے عادی ہو گئے ہیں، حتّٰی کہ مشاعرے میں اپنا کلام پڑھتے وقت بھی ان کی سپیڈ اتنی تیز ہوتی ہے کہ وہ اٹھارہواں شعر پڑھ رہے ہوتے ہیں۔ تو سامعین ابھی آٹھویں شعر ہی پر داد دینے میں مشغول ہوتے ہیں۔ میں نے انھیں ایک بار مشورہ دیا کہ وہ اشعار سناتے وقت رفتار ذرا آہستہ رکھا کریں۔ خدا کا شکر ہے کہ انھوں نے میری بات مان لی، چنانچہ

اب ان کے کلام اور سامعین کی دار میں صرف تین چار شعروں ہی کا فاصلہ رہ گیا ہے۔

عبدالعزیز خالد یہ فاصلہ اپنے اور شاعروں کے سامعین ہی کے مابین نہیں، کچھ اور مواقع پر بھی برقرار رکھتے ہیں۔ شاعر ہونے کے ناطے سے میں نے انھیں شاعرات یا غیر شاعرات سے ہنستے بولتے تو دیکھا ہے۔ مگر اس کے آگے وہ غالباً فاصلے ہی فاصلے کے قائل ہیں۔ یہ غالباً کا لفظ میں نے اس لیے استعمال کیا ہے کہ غیب کا علم تو خدا ہی کو ہے، سو میں نے جو کچھ دیکھا ہے وہ صرف اتنا ہی ہے کہ دفتر میں بیٹھے ہوئے انھوں نے ایک ملائم ٹیلی فون کال ریسیو کی اور پھر ہنسنے بولنے کا عمل شروع ہو گیا۔ اپنی بات ابھی پوری کرتا ہوں۔ پہلے آپ کو یہ بتاؤں کہ خالد کی گفتگو میں علم کی چاشنی صدرجہ ہوتی ہے اور وہ ہلکی پھلکی گفتگو میں بھی پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل پر کچھ اس طرح روشنی ڈالتے ہیں کہ تمام گرہیں ایک ایک کر کے کھلتی محسوس ہوتی ہیں؛ چنانچہ انسان ان کے پاس بیٹھ کر کچھ نہ کچھ سیکھتا ہی ہے۔ گنواتا کچھ نہیں؛ تاہم اس روز مجھے پہلی بار ان کی علمی گفتگو بے موقع لگی، کیونکہ دوسری طرف "بہاریہ" گفتگو ہو رہی تھی۔ اپنے خالد صاحب ماشاء اللہ گریجوایٹ ہیں اور وہ خاتون بھی یقیناً گریجوایٹ ہوں گی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان کے مابین علمی مباحثے کا یہ انداز مجھے پسند نہ آیا (اکبر الہ آبادی بھی کیا سوچتے ہوں گے؟)

کہنے کی باتیں تو اور بھی بہت سی ہیں، مگر آخر میں صرف یہ کہوں گا کہ ہم برصغیر کے مسلمان بڑے جذباتی واقع ہوئے ہیں اسلام سے وابستہ ہر چیز سے ہمیں عشق ہے اور یہ عشق بسا اوقات ہمیں کنفیوز بھی کر دیتا ہے۔ چنانچہ عبدالعزیز خالد کے کلام میں عربی الفاظ اور عربی مقولوں کی بہتات دیکھ کر ہم نے انھیں جبہ و دستار پہنا کر اونٹ پر سوار کر دیا ہے۔ بالکل اس سادہ لوح مسلمان کی طرح جو دو عربوں کو آپس میں گفتگو کرتے دیکھ کر ہاتھ باندھ کر مؤدب کھڑا ہو گیا تھا کہ شاید تلاوت ہو رہی ہے۔ ہمارے بعض نقاد بھی عبدالعزیز خالد کے کلام میں عربیت دیکھ کر کچھ اس طرح مؤدب کھڑے ہو گئے ہیں کہ ان کے کلام کی بے شمار جہتوں کی طرف کسی کا دھیان ہی نہیں گیا۔ خدارا اب سلام پھیریں کہ عبدالعزیز خالد آپ کی توجہ کا منتظر کھڑا ہے۔

سائرہ ہاشمی

عبدالعزیز خالد

میں عبدالعزیز خالد کو نہیں جانتی۔ شاید اس لیے کہ انسان پرت در پرت تہوں میں پوشیدہ اور بلندیوں کی طرف پرواز کی طاقت رکھتا ہے اور اُسے جاننا آسان نہیں۔ اُس کے اَنتر تک پہنچنا ناممکن ہے۔

میں عبدالعزیز خالد کو جانتی ہوں کیونکہ پچھلے پندرہ برسوں پر محیط وقت کے اُتار چڑھاؤ پر واقفیت کی ناؤ بہے چلی جارہی ہے۔ پندرہ برس جن میں میں اور میرا خاندان خالد صاحب اور اُن کا خاندان ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک رہے ہیں۔ مجھ میں اور خالدہ میں یعنی مسز خالد میں اچھے دوستوں جیسی رفاقت ہے اور اتنے برسوں کی یہ دوستی کی ڈور خالدہ نے اپنے ہاتھ میں تھام رکھی ہے۔ اس لیے ہمارے درمیان غلط فہمیوں کی کوئی گنجائش نہیں۔ خالد صاحب قدرے مختلف انسان ہیں۔ جیسے وہ زندگی کے ہنگاموں کا حصہ ہوتے ہوئے بھی وہاں نہ ہوں۔ میں نے تو انھیں ان کے بچوں کی شادیوں میں بھی بڑا شانت پایا ہے جیسے قدرے فاصلے پر کھڑے۔ چہرے پر مسکراہٹ لیے زندگی کا تماشا دیکھ رہے ہیں۔ الگ۔ لا پرواہ لا اُبالی سے۔ اپنی ہی ذات میں مگن۔

شاید اُن کی ایسی ہی عادات کی وجہ سے ایک دفعہ کسی خاتون نے بڑی عقیدت سے کہا تھا "خالد صاحب تو زندہ ولی ہیں۔" اور میں نے چونک کر اُن کی طرف دیکھا۔ میں نے آج تک کبھی کسی ولی کو زندہ نہیں دیکھا تھا۔۔۔

خالد صاحب بڑے رسان سے وہاں بیٹھے زیرِ لب مسکرا رہے تھے۔ بالکل عام انسانوں جیسے۔ عام انسانوں جیسی مسکراہٹ چہرے پر سجائے۔ تھوڑی دیر پہلے ہی تو وہ ایک خوب صورت خاتون کے سراپے کو بڑی فراخدلی سے سراہ رہے تھے۔ اُس کے اندر چھپے ادبی رجحان کی الفاظ سے آبیاری کر رہے تھے۔ بار بار اُسے بڑھاوا دے رہے تھے۔ اس کی ذات کے سحر میں گرفتار خالد صاحب شاعر ہیں۔ خوب صورتیوں کے رسیا۔ خوب صورت چہروں کو لگاوٹ بھری نظروں سے تاکتے ہوئے جیسے کہہ رہے ہوں۔

قوس کی طرح تنی — لوح کی تصویر بنی
صنعتِ آذری و — شعبدۂ برہمنی

اور وہ خود ہی آذر ہیں، خود ہی برہمن جو تمام خوبصورتیوں کو ذہن کے بت خانہ میں پوجتے رہتے ہیں۔ اپنی ہی تخلیق کے سامنے سجدہ ریز۔

مجھے اُس خاتون کے مذہبی عقیدے پر شک سا ہونے لگا۔ میں خود بدعقیدہ نہیں تھی۔ میں نے خالد صاحب کی "حدیثِ خواب" کو شاید اُن سے زیادہ بہتر طریقے سے پڑھا تھا۔ جہاں وہ جسمانی خوبصورتیوں کا ایک دنیاوی لذت سے ذکر کرتے ہیں۔ اس لیے میں نے ان کے ولی اللہ ہونے کا یقین نہ کیا۔ شاید وہ ہوں لیکن میں انھیں ایک انسان ہونے کے حوالے سے زیادہ جاننا پسند کروں گی۔ ہاں وہ ایک اچھے اور پُرخلوص انسان ہیں۔ اور مجھے اپنے ادراک پر کوئی شک نہیں۔

بزمِ ہمنفساں میں خالد صاحب ہمیشہ آئے ہیں اور ایک روز ڈاکٹر میمونہ انصاری نے کہا "خالد صاحب اچھے آدمی ہیں" اور میں سمجھتی ہوں جب کوئی کسی کی تعریف اُس کی غیر حاضری میں کرے تو وہ یقیناً حقیقت پر مبنی ہوگی۔ وہ یقیناً اچھا انسان ہوگا اور آپ کو اُس پر یقین کر لینا چاہیے۔ بہت سے لوگ اس بات کی گواہی دے سکتے ہیں اُن میں سے میں بھی ایک ہوں۔ وہ بے ضرر۔ پُرخلوص اور ریا سے عاری انسان ہیں۔ لیکن میں پھر بھی ان کو ولی نہیں کہوں گی۔ کیونکہ ولی ہونے سے انسان ہونا بہت مشکل ہے۔ میں نے جب لکھنا شروع کیا تو خالد صاحب بھی اُن چند لوگوں میں شامل تھے۔ جنھوں نے میری حوصلہ افزائی کی۔ اُن کا بڑھاوا میرا حوصلہ بنا اور آج میں پورے اعتماد کے ساتھ آپ کے سامنے موجود ہوں۔ میں کیا بن پائی۔ کیا بن پاؤں گی۔ وقت کی اندھیری اور عمیق غار میں میرے لیے کونسی روشنیاں ہیں۔ یہ کوئی بھی بتا نہیں پاتا۔ لیکن وہ چند الفاظ جو کسی کو اس کے ہونے میں یقین دلائیں بڑے ہی قیمتی ہوتے ہیں۔ پشت پر آکر اوندھے منہ گرانے کی کوشش کرنے والوں کا ذکر کرنے لگوں تو بات طوالت پکڑ جائے گی اور پھر مجھے اپنا ذکر نہیں کرنا۔ خالد صاحب کی زندگی کا مقصد حوصلے اور اعتماد بانٹنا ہے۔ وہ بغیر کسی لالچ کے اپنی متعین کی ہوئی ڈگر پر چلتے جا رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے وہ تعریف فن سے زیادہ فن کار کی ہو۔ لیکن خالد صاحب کوہ کن کی طرح انسانوں کے اندر پوشیدہ جوہر کی تلاش میں بڑی سچائی سے مصر رہتے ہیں۔ چاہے وہ مرد ہو یا عورت۔ آپ کو کسی مشکل بات کا حل نہ سوجھے۔ آپ اپنے فن کے بارے میں ڈھل مل یقین رکھتے ہیں۔ لوگوں کی باتوں سے آپ کا حوصلہ پست ہو رہا ہے۔ آپ لکھنے یا نہ لکھنے کے دوراہے ہوں۔ آپ پورے یقین کے ساتھ خالد صاحب کا فون نمبر ڈائل کیجیے۔ دو بار "جی۔ . . . جی" کا لفظ سنائی دے گا اور پھر آپ کے اندر ایک نیا یقین جنم لے گا۔ یہ ضروری نہیں کہ آپ ان کے قریبی ملنے والے یا دوست ہی ہوں۔

وہ کہتے ہیں۔ "زندگی میں اتنے دکھ ہیں۔ اتنی محرومیاں ہیں۔ ایک انسان کو اُن میں اضافہ کرنے کی بجائے انھیں کم کرنے میں مدد دینی چاہیے۔ خوشی کے دیئے جلائے چلے جانے چاہئیں۔ چاہے وہ لمحاتی روشنی ہی کیوں نہ دیں۔" اور خالد صاحب ایسے دیئے جلائے جاتے ہیں۔ بہت سے لوگ اس بات کی گواہی دے سکتے ہیں۔ لیکن میں پھر بھی ان کو ولی نہیں مانتی۔ حالانکہ وہ کلامِ پاک کا منظوم ترجمہ کر چکے ہیں۔ اُنھوں نے کئی حمد و نعت کے مجموعے لکھ ڈالے ہیں۔ اُنھوں نے مہابھارت کتھن مالا لکھ کر دوسرے مذہب کی سچائیوں کی کھوج کی ہے۔ وہ انسانی فطرت

نیکی کے جویاں ہیں۔ نیکی جو تمام مذاہب۔ فرقوں۔ قبیلوں سے ماوریٰ اور بلند ہوتی ہے۔ اُنھوں نے مہابھارت کتھن مالا کو معنون کیا ہے۔

ہندو پاکستان کے اُس مشترک ماضی کے نام
جس میں پوشیدہ ہے اِک مستقبل نو کا پیام

لیکن صاحبان آپ اُنھیں زاہد خشک تک سمجھ لیجئے گا۔ شاعر کبھی زاہد اور بے ضرر نہیں ہوتا اور وہ تو ہیں ہی خوبصورتیوں کے پجاری۔ پجاری تو کہتے ہی اُسے ہیں جو اپنی ذات کو تج کر دوسروں کے سامنے جھک جائے۔ اپنی نفی کر دے۔ خوب صورتیاں جو الفاظ میں پوشیدہ ہوتی ہیں۔ خیالات کے سمندر میں موجزن رہتی ہیں۔ چہروں پر جلوہ گری کرتی ہیں۔ خالد صاحب ایسی خوب صورتیوں کے بھی رسیا ہیں۔ عبدالعزیز خالد۔ الفاظ کے سمندروں کا شناور، الفاظ گر۔ الفاظ جو تمام زمان و مکاں سے نکل کر اُن کے سامنے دست بستہ کھڑے رہتے ہیں جو عام انسانوں کی پہنچ سے بلند اور دور رہتے ہیں لیکن خالد صاحب اُن کے فرماں روا ہیں۔ خالد صاحب جو عالم ہیں۔ زبان و ادب پر مکمل دسترس رکھتے ہوئے۔

اور پھر مجھے اپنی کم علمی کا گلہ ہونے لگتا ہے۔ میں اُن کی شاعری کو پورے طور پر سمجھ نہیں پاتی۔ عظیم اور گرانمایہ الفاظ کی دیواریں میری راہ روک لیتی ہیں لیکن میں پڑھتی جاتی ہوں اور پھر یہ دیواریں آہستہ آہستہ معدوم ہوتی چلی جاتی ہیں یا میں اُن کی موجودگی سے مانوس ہو جاتی ہوں۔ اور پھر مجھے اُن میں تازگی و زندگی۔ باطن کی جدّت میں گھلے ہوئے افکار ملتے ہیں۔ جن میں لذتوں کی کئی پرتیں ہیں۔ تندی و روانی ہے۔ تلمیحات و استعارات فکر کے تانے بانے اور وسیع مطالعے پر دلالت کرتے ہیں۔

عبدالعزیز خالد علم کے جویا ہیں۔ وہ ہمیشہ نئی نئی زمینوں۔ انوکھے افکار۔ دلپذیر واقعات کی تلاش میں دنیائے علم کا سفر کرتے رہتے ہیں۔ دُنیائے حسن کو کھنگھالتے ہیں۔ ماضی کے اوراق میں چھپی حسیناؤں کی زلفِ گرہ گیر کے اسیر ہوتے ہیں۔ خیالات کی وجاہتوں اور صنفِ نازک کو دلنوازیوں کا تذکرہ کرنے میں عجیب سرخوشی محسوس کرتے ہیں۔ اور یہ سرخوشی ہمیں سلوی کے سراپے میں پوری ادبی معنویت۔ بلیغ و لطیف فن کاری۔ عاشقانہ لطف انگیزی اور عالمانہ چابک دستی سے ملتی ہے۔ وہ ایک نے نواز کی بے خودی کے ساتھ شاعرانہ اسلوب کے بہاؤ کے ساتھ بہے چلے جاتے ہیں۔

اُن کی ہمہ گیر قادر الکلامی اور ذہانت ہمیں حد درجہ مرعوب کرتی ہے۔ وہ بارعب۔ پُرشوکت اور توانا لہجے کے ساتھ علامہ اقبال اور جوش ملیح آبادی کی تجدید کرتے ہیں۔

اُردو ادب کا گرانمایہ سرمایہ۔ اُن کی غزلیں بھی اُسی پُرشوکت الفاظ کی غمّاز ہیں۔ میں کوئی نقاد نہیں ہوں۔ میں تو ہر تاثّر کو قاری کے دل کے ساتھ قبول یا رد کرتی ہوں۔ ان تمام عظمتوں اور بڑائیوں۔ علم و فن۔ رومانوی

شاعری وہ واردات ہے جو زمانوں سے ہر شاعر اپنی ہی ذات کے حوالے سے پرکھتا آ رہا ہے۔ وہ اپنے دل کے رنگ سب طرف بکھیرتا ہے۔ اور ذہنی ریاضت کرتے ہوئے وہ اپنے اندر کی ایک معصوم اور حقیقی واردات کو قلمبند کرنا بھول گئے ہیں۔ داستان جو دل کی دھرتی سے پھوٹتی ہے جو پڑھنے والوں کی پوروں میں سرایت کرتی ان کی رُوح کو دھرتی اور دل کے نزدیک تر لے آتی ہے۔ ایک قاری کی حیثیت سے میں نے ہمیشہ چاہا ہے کہ تمام بڑائیوں اور علم و فن کے بھاری وجود کو ہٹا کر اُس خودرَو کونپل کا سبزہ دیکھ سکوں۔ خالد صاحب کے ہاں وہ کونپل تہ در تہ معنوی ادراک تلے چھپ جاتی ہے۔ قاری کا دل پوری طرح بھیگ نہیں پاتا۔ خالد صاحب رنگوں کی ہولی اکیلے ہی کھیلتے رہتے ہیں شاید وہ اپنے اندر کی دنیا کو دوسروں کے ساتھ پوری طرح، شیئر کرنا نہیں چاہتے۔ حالانکہ اُن کی ذہنی اور تصوراتی محبوباؤں کے ان گنت نام ہیں۔ وہ کبھی قرۃ العین کبھی ہیر۔ کبھی سسّی اور کبھی صاحباں کا رُوپ دھارتی ہے۔ وہ بڑے مزے سے اُن سے کُھل کھیلتے ہیں۔ ان کی بیوفائیوں کا گلہ بھی کرتے ہیں۔ اُن کی چلتر بازیوں کا مردانہ نظروں سے جائزہ لیتے اور اُن پر اُسی حساب سے تہمتیں بھی لگاتے ہیں۔ لیکن ہمیشہ کی طرح فاصلے پہ کھڑے نظر آتے ہیں۔ مسکراتے ہوئے عام سطح سے بلند اور بے پرواہ۔

حضرات یہ میری ذاتی رائے ہے اور میں کوئی نقّاد نہیں ہوں۔

خالد صاحب پر بہت سے ضخیم نمبر نکل چکے ہیں۔ نکل رہے ہیں۔ نکلتے رہیں گے۔ میں اُن میں رتّی بھر اضافہ نہیں کر سکتی۔

میں ایک بار پھر کہنا چاہوں گی کہ خالد صاحب نے اُس ننھی سی کونپل کی تلاش پوری شدّت سے نہیں کی۔ شاید وہ اُن کے آس پاس۔ اُن کے پاؤں تلے۔ اُن کے دل کے کسی کونے میں ان کی توجّہ کی منتظر ہو۔ خالد صاحب کو اُس کی تلاش ضرور کرنی چاہیئے اور پھر جو نغمہ پھوٹے گا وہ اُن کے قاری کو اُن کے اور زیادہ نزدیک لے آئے گا۔ میں یہ مشورہ مسز خالد سے معذرت کے ساتھ دے رہی ہوں۔ . . . . صرف ایک قاری کی حیثیت سے!

شبنم شکیل

اے روشنیِ طبع!

خالد صاحب اُن لوگوں میں سے ہیں کہ جن کے "افسانے" "اُس گلی" میں اُن سے "پہلے" پہنچ جاتے ہیں۔ چنانچہ جو لوگ اُن سے مل چکے تھے یا جو لوگ اُن سے نہیں ملے تھے دونوں کی زبانی میں نے خالد صاحب کی تنک مزاجی کے قصّے سن رکھے تھے۔ کسی نے بتایا "انہیں اپنے علم پر بہت غرور ہے"۔ کسی نے کہا "کسی کو خاطر میں کب لاتے ہیں"۔ ذرا ٹیڑھے آدمی ہیں"۔ کوئی بولا "فلاں آدمی سے خالد صاحب کسی بحث میں اُلجھ گئے تھے وہ بیچارا تو رو پڑا"۔ "بہت وسیع مطالعہ ہے اُن کا ہر مضمون پر مگر بھئی اُن سے کچھ پوچھتے ہوئے ڈر محسوس ہوتا ہے" "اپنی کم علمی کا احساس بہت شدید ہوتا ہے نا اُن کے پاس جا کر" یہ تھیں وہ باتیں جو میں نے خالد صاحب سے ملنے سے پہلے لوگوں سے سُن رکھی تھیں۔ اشتیاق خود مجھے بھی بہت تھا اُن سے ملنے کا۔ مگر یہ ساری افواہیں اس ملاقات کے آڑے آ رہی تھیں۔ کئی دفعہ شعر کہتے ہوئے کسی فارسی ترکیب پر اٹک گئی تو دل چاہا کہ انھیں فون کر دوں کیونکہ جانتی تھی کہ اس معاملے میں اُن سے بہتر اور کوئی رہنمائی نہ کر سکے گا۔ مگر پھر اپنی علمی کم مائیگی کا خیال آ جاتا تو یہ ارادہ ترک کر دیتی "کیا خبر مذاق ہی نہ اُڑائیں کہ اتنا بھی نہیں جانتی ہے"۔

میرے ایک بہنوئی انکم ٹیکس سروس سے تعلّق رکھتے ہیں۔ اُن کی تعیّناتی لاہور میں ہوئی تو کسی کام کے سلسلے میں اُن سے ملنے انکم ٹیکس کے دفتر پہنچی۔ وہاں پہنچ کر خیال آیا کہ خالد صاحب بھی کہیں قریب ہی بیٹھیں ہوں گے اپنے اعصاب کو ذرا مضبوط رہنے کی تلقین کرتے ہوئے اُن سے ملنے پہنچی۔ دروازہ کھولا پوچھا "اندر آ سکتی ہوں"۔ خالد صاحب نے فائلوں پر سے نگاہ اُٹھائے بغیر کہا: "تشریف لائیے! میں بیٹھ گئی۔ وہ فائلوں میں غرق رہے۔ اسی دوران وہ فون پر سرکاری بات چیت بھی کرتے رہے۔ ایک دو آنے والوں کو کچھ ہدایات بھی دیتے رہے۔ یہ پانچ منٹ کا مرحلہ مجھ پر بہت کڑا گزرا کیونکہ ان کے لیے جو میرا پہلا تاثر تھا وہ یہ کہ وہ ایک منجھے ہوئے بیوروکریٹ ہیں۔ اور اب مجھ سے وہی سلوک کریں گے کہ جو ایک پبلک سروس کمیشن کے انٹرویو دینے والے کے ساتھ روا رکھا جاتا ہے۔ چنانچہ میں نے ذہنی طور پر اپنے آپ کو تمام ممکنہ علمی و ادبی سوالات کے لیے تیار کرنا شروع کر دیا۔

(یہ تاثر بعد میں یکسر غلط ثابت ہوا وہ شاعر پہلے ہیں اور بیوروکریٹ بعد میں)

خیر اُنھوں نے فائلوں کا مطالعہ ختم کیا اور میری طرف متوجہ ہوئے۔ چہرے پر مسکراہٹ آئی اور تھوڑی دیر پہلے اور انتہائی رنجیدہ چہرہ شگفتہ ہو گیا۔ یہ شگفتگی پھر تمام عرصہ قائم رہی۔ میں تقریباً آدھ گھنٹہ وہاں بیٹھی۔ ادب اور ادیب دونوں زیرِ بحث آئے۔ مگر ایک چیز مجھے اس پہلی ملاقات میں کھٹکی وہ یہ کہ وہ اپنے ہم عصروں کے بارے میں بات کرنے سے گریز کرتے رہے۔ (وہ اس مؤقف پر آج بھی قائم ہیں اور اپنے ہم عصر ادیب اور شاعروں کے بارے میں کھل کر اظہارِ رائے کرنے سے ہمیشہ اجتناب برتتے ہیں) بہرحال مجھے اس ملاقات میں ایک لحظہ کے لیے بھی یہ احساس نہیں ہوا کہ میں علمی طور پر ایک کم مایہ انسان ہوں اور جب میں وہاں سے اُٹھی تو اپنی علمی و ادبی معلومات اور اپنی شاعری کے بارے میں پہلے سے زیادہ پُر اعتماد تھی۔ "اعتماد" ہاں یہی ایک لفظ ہے کہ جو میں استعمال کرنا چاہتی ہوں۔ آج کے ڈھلمل یقین دور میں خالد صاحب کی پُر اعتماد شخصیت اپنے مخاطب کی ذات میں بھی اعتماد پیدا کرنے کا باعث بنتی ہے۔ ان کی مثبت وصاف ستھری سوچ کی شعاعیں دوسرے پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ اُن سے ملنے کے بعد معلوم ہوا کہ صاف ستھری ہموار سوچ کیا ہوتی ہے "کوئی شک وشبہ نہیں"، کوئی "اگر" نہیں کوئی "شاید" نہیں۔ جو ہے وہ ہے۔ اور جو نہیں ہے وہ نہیں ہے۔ گفتگو میں ابہام کا کہیں شائبہ تک نہیں۔ صاف اور کھری بات۔ جو افسانے اور افواہیں لوگ خالد صاحب کے بارے میں پھیلاتے رہتے ہیں۔ اُن میں اُن کے "صاف اور کھرا" ہونے کا بہت حصّہ ہے۔ آپ جانتے ہیں سچ ذرا بدمزہ تو ہوتا ہے اسے نگلنا آسان کام نہیں۔ ادھر خالد صاحب ہیں کہ اس بات پر اڑے ہوئے ہوتے ہیں کہ سچ کہوں گا اور سچ کے سوا کچھ نہیں کہوں گا۔ اب آپس کی بات ہے۔ اپنی زبان بنائیے گا کہ سچ کے معاملے میں میرے ساتھ بھی ان کی کئی دفعہ تلخی ہوئی ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ سچ کو شکر میں لپیٹ کر پیش کیا جائے۔ وہ مصر ہوتے ہیں کہ سچ میں آمیزش نہیں ہو گی۔ کئی دفعہ ایسا ہوا ہے کہ میں نے کوئی ادبی حوالہ دیا۔ اُنھوں نے کسی مستند کتاب کا نام لیا۔ "پڑھی ہے؟" "نہیں پڑھی" میں نے جواب دیا۔ تو پھر آپ سے بحث بیکار ہے۔ پہلے وہ کتاب پڑھ کر آئیے پھر مجھ سے بات کیجئے گا کیونکہ اس طرح وقت ضائع ہوتا ہے۔" اس کے بعد اُن سے کئی ہفتے ملاقات نہیں ہوتی کیونکہ میں وہ کتاب پڑھ نہیں پاتی۔ ملتی اُس وقت ہوں کہ جب وہ اس کتاب کو یکسر بھول چکے ہوتے ہیں۔ شاید کچھ لوگ ان کی اس صاف گوئی کو بدلحاظی پر محمول کرتے ہوں گے۔ لیکن ان کی شخصیت کو سمجھنے کے بعد یہ غلط فہمی دور ہو جاتی ہے۔ ایسی باتوں سے اُن کا مدعا ہرگز یہ نہیں ہوتا کہ ملنے والا افسردگی یا مایوسی کا شکار ہو جائے۔ جہاں لاکھوں الفاظ اُن کے آگے ہاتھ جوڑے کھڑے ہیں یہ دو لفظ ان کی ذہنی لغت میں موجود ہی نہیں۔ جہاں تک میں سمجھی ہوں ہیں۔ اور ایسے لوگ کافی مشکل ہوتے ہیں۔ خالد صاحب بھی کبھی کبھی خاصے مشکل ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس مشکل پسندی میں بھی آج تک وہ کہیں ذہنی پراگندگی کا شکار ہوتے ہوئے محسوس نہیں ہوئے۔ پر آج کے دور میں جب وہ ہر تیسرے پڑھے لکھے شخص کو ذہنی

پراگندگی کا شکار اور کنفیوزڈ دیکھتے ہیں۔ تو بہت پریشان ہو جاتے ہیں۔ کیوں آخر ایسا کیوں۔ وہ کئی دفعہ کہتے ہیں۔ اور یہی وہ مقام ہے کہ جہاں اور لوگوں نے میری طرح خالد صاحب کو غصے میں آتے دیکھا ہو گا۔ لیکن غصے کی یہ لہر بہت عارضی ہوتی ہے۔ کثرتِ مطالعہ نے انھیں بہت وسیع القلب اور کشادہ ذہن کر دیا ہے۔ چنانچہ وہ اپنے غصے کو ضبط کرتے ہیں اور دوسرے کے نقطۂ نظر کو دوبارہ سمجھنے کی کوشش میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ "میرا مطلب یہ نہیں تھا۔ وہ بہت ٹھنڈے لہجے میں کہتے ہیں بہرحال چلتے چلتے آپ کو ایک بات بتاتی چلوں۔ خالد صاحب کی شخصیت کی بہت تہیں ہیں۔ اور میں یا میرے جیسے اور بہت سے لوگ جو ان کو جاننے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اُن کے سامنے بھی کبھی کبھی اُن کی شخصیت کا ایک ایسا اجنبی رُخ آتا ہے کہ جس سے کسی صورت بھی کوئی آشنائی محسوس نہیں ہوتی۔ اُس وقت ایسا لگتا ہے کہ شاید خالد صاحب نے واقعی اپنے آپ کو اپنے تک محدود کر رکھا ہے۔ کسی کی وہاں تک پہنچ نہیں۔ اُس وقت کے لیے میرا مشورہ یہ ہے کہ تاثیر کا یہ شعر پڑھ لیا جائے:

یہ دلیلِ خوش دلی ہے مرے واسطے نہیں ہے
وہ دہن کہ ہے شگفتہ وہ جبیں کہ ہے کشادہ

گلزار وفا چودھری

عبد العزیز خالد

نام : عبد العزیز خالد
تخلّص : خالد
امتیازی نشان : زبان میں لکنت
کام : شاعری۔
مشغلہ : انکم ٹیکس کمشنری۔

جناب عبد العزیز خالد سُوپر سانک سپیڈ کے شاعر ہیں۔ لگاتار بلکہ زار و قطار شعر کہتے ہیں اور موسلا دھار شعری مجموعے چھپواتے ہیں۔ جتنی مدت میں ان کا کوئی ماتحت انکم ٹیکس کا ایک گوشوارہ تیار کرتا ہے تقریباً اتنے ہی عرصہ میں وہ ایک عدد شعری مجموعہ تخلیق کر لیتے ہیں۔ تادم تحریر اپنی تقریباً بتیس سالہ شاعرانہ زندگی میں پورے بتیس شعری مجموعے تخلیق ہی نہیں کیے بلکہ شائع کرا کر تقسیم بھی کر چکے ہیں (زیرِ تقسیم پر ہے) اگر زبان میں لکنت نہ ہوتی تو شاعری کی مقدار کہیں زیادہ ہوتی۔

خوب صورت اور وجیہہ آدمی ہیں۔ خوب صورتی اور وجاہت کے دلدادہ بھی ہیں بلکہ سچ یہ ہے کہ باقاعدہ حُسن پرست بھی ہیں۔ مطالعہ از حد وسیع ہے۔ اَدبی پرچوں اور اڈیشنوں میں چھپی ہوئی کوئی چیز ان کی زد سے کم ہی بچتی ہے۔ کتابوں کے صحیح معنوں میں عاشق ہیں۔ کسی کے ہاتھ میں کتاب دیکھیں تو مانگنے کی بجائے جھپٹ لیتے ہیں۔ جس طرح اپنی تصنیف دے کر واپس نہیں مانگتے۔ اسی طرح دوسروں کی کتابیں لے کر واپس نہیں کرتے۔ بہ امرِ مجبوری وہ کتاب واپس کرتے ہیں جس کی واپسی کا وعدہ لیا گیا ہو۔ بولتے وقت جملے کو تیز تیز اور تکرار کر کے اس طرح ادا کرتے ہیں کہ سننے والے کو ان کا ہر جملہ حفظ ہوتا چلا جاتا ہے۔

عزم کے راسخ اور دھن کے پکے ہیں، جو ارادہ باندھ لیتے ہیں طعن و تشنیع تو کیا خشت و سنگ بھی برسیں تو اس سے باز نہیں آتے۔ مخلص اور بے لوث انسان ہیں۔

کسی سے کوئی غرض وابستہ کرتے ہیں نہ کرنے دیتے ہیں۔ کسی کی سفارش کرتے ہیں نہ مانتے ہیں۔ چنانچہ بعض حلقوں

ہیں "بے فیض" بھی گردانے جاتے ہیں۔

شاعروں اور ادیبوں میں جونیئر اور سینئر کی تمیز روا نہیں رکھتے۔ بلکہ ایسی تمیز روا رکھنے والوں کو بد تمیز سمجھتے ہیں۔ سب سے ہنستے چہرے اور کھلے دل سے ملتے ہیں۔ انسانی رشتوں کو عملاً افضل سمجھتے ہیں۔ افسری دوسروں کی برداشت کرتے ہیں نہ اپنی۔ کوئی انھیں دوست انسان یا شاعر کی حیثیت سے ملے تو دیدہ و دل فرش راہ کر دیتے ہیں۔ کمشنر سمجھ کر ملے تو یہ کہتے ہوئے لبساطِ الفت سمیٹ لیتے ہیں۔

"کمشنر صاحب بہت مصروف ہیں، بہت مصروف ہیں، بہت مصروف ہیں۔ ان کے پاس کوئی وقت نہیں، کوئی وقت نہیں، کوئی وقت نہیں"

اسی طرح کوئی قسمت کا مارا بڑا افسر یا وزیر اپنے تعارف کی بجائے اپنے عہدے کا تعارف کراتے ہوئے ملے تو برف جیسے ٹھنڈے لہجے میں کہتے ہیں:

"میرے اسسٹنٹ کمشنر سے ملیں، اسسٹنٹ کمشنر سے ملیں، اسسٹنٹ کمشنر سے ملیں"

عبدالعزیز خالد فنِ شعر میں بے حد مشکل پسند واقع ہوئے ہیں دوسروں کے ساتھ خود کو بھی مشکلات میں مبتلا رکھتے ہیں۔ کیونکہ جن اشعار کا سمجھنا مشکل ہے۔ ان کا کہنا کتنا مشکل ہوتا ہوگا۔ ان کے اشعار کو سمجھنے کا عمل ماہی گیری کے عمل سے مشابہ ہے جس طرح مچھلی قسمت سے جال میں پھنستی ہے اسی طرح ان کے اشعار کے معنی بھی قسمت سے ذہن میں آتے ہیں۔ ان کی شاعری "ڈکشنریاں" مرتب کرنے والوں کے لیے ایک "تحفہ" ہے۔ جس سے اُردو کے علاوہ عربی اور سنسکرت کے لغت نویس بھی یکساں سہولت کے ساتھ استفادہ کر سکتے ہیں۔ چونکہ لغت میں ان کا مقام اونچا ہے۔ شاعری میں بھی اونچا ہی ہوگا۔ تاہم جب تک ان کی شاعری کو سمجھنے کا کوئی طریقہ دریافت نہیں ہوتا کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

عبدالعزیز خالد کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ تخلیق اور تنقید میں توازن قائم رکھتے ہیں۔ جتنا وزن ان کی تخلیقات کا ہوتا ہے اتنا ہی ان کی تخلیقات کے بارے میں تنقیدی مقالوں اور عبدالعزیز خالد نمبروں کا ہوتا ہے۔ دونوں میں سے کسی کو کم یا زیادہ نہیں ہونے دیتے۔

اب کچھ عرصہ سے انھوں نے دیدہ دانستہ اپنی آرام دہ کار فروخت کر دی ہے۔ اپنے بارے میں کوئی نیا نمبر چھپوانے کی غرض سے نہیں بلکہ یہ دیکھنے اور محسوس کرنے کے لیے کہ "بے کار" عوام کس حال میں ہیں۔

چنانچہ اب وہ ہم ایسوں کی طرح آومنی بسوں اور منی بسوں پسینے میں شرابور اور مرطے تڑے سفر کرتے دیکھے جاتے ہیں۔ دیکھئے ان کے معمولات میں اس غیر معمولی تبدیلی کا اثر ان کے شعری پہ کیا پڑتا ہے۔

یوں تو جناب عبدالعزیز خالد بظاہر روحانی تجربوں کے شاعر مشہور ہیں لیکن یہ روحانی شاعری وہ جسمانی تجربوں میں اس قدر ڈوب کر کرتے ہیں کہ ان کی شاعری کا ایک اچھا خاصا حصہ "صرف بالغوں کے لیے" کے زمرے میں آتا ہے۔ بلکہ بقول ابن انشا مرحوم عبدالعزیز خالد نے "کئی جگہ ٹاپ لیس (   ) کی شاعری کی ہے"۔

Topless

ایم - آر - فاروقی

ایک مُنصف

یہ ۱۹۸۵ء کی بات ہے جب حفیظ صدیقی صاحب نے "تحریریں" کا خالد نمبر شائع کیا اور اس کی ایک کاپی مجھے بھی عنایت فرمائی۔ عبدالعزیز خالد صاحب کے متعلق ہر اہل قلم نے کچھ نہ کچھ اور کچھ ان کی علمی، اور ادبی خدمات کو سراہا۔ میں نے حفیظ صدیقی سے کہا کہ کسی نے بھی خالد بطور مُنصف کے موضوع پر کچھ نہیں لکھا۔ اُنہوں نے یہ کام میرے ہی سپرد کر دیا۔ معاشی مصروفیتوں میں وقت گزرتا گیا لیکن حفیظ صدیقی صاحب کا اسرار بڑھ گیا۔ آج حفیظ صدیقی صاحب تشریف لائے اور الٹی میٹم دے گئے کہ مزید وقت نہیں ملے گا۔

عبدالعزیز خالد صاحب پر لکھنے کے لیے قلم اُٹھایا تو اپنی کم علمی کم مائیگی سامنے آگئی۔ کہ ایک آفتاب علم و کمال دفن پر مجھ جیسے کیا لکھے گا لیکن حفیظ صدیقی صاحب کے الٹی میٹم کے سامنے جھکنا پڑا۔

اب سے کوئی بیس برس پہلے کی بات ہے جب خالد صاحب سے میری پہلی ملاقات ہوئی۔ اُس وقت خالد صاحب مرکزی ریونیو بورڈ میں تعینات تھے مجھے ایک دفتری کام کے سلسلہ میں کراچی جانا پڑا۔ کارڈ بھجوایا۔ اُسی وقت طلبی ہو گئی۔ ایک خوش شکل سرخ سفید رنگت کے مالک نوجوان نے اُٹھ کر مصافحہ کیا۔ یہ عبدالعزیز خالد صاحب تھے۔ رسمی علیک سلیک کے بعد میں نے اپنا مدّعا مختصراً بیان کیا اور مطلوبہ کاغذات جو اس سے پہلے بھی کئی بار بھجوا چکا تھا پیش کیے۔ خالد صاحب نے ایک سرسری نظر ڈالی اور کاغذات رکھ کر فرمایا کہ میری تعیناتی چند روز ہوئے اس سیکشن میں ہوئی ہے۔ میں دیکھ کر جواب بھجوا دوں گا۔ اس کے بعد خالد صاحب سے اِدھر اُدھر کی باتیں ہوئیں شاید اس لیے کہ میں لاہور سے آیا تھا اور خالد صاحب کا تعلق بھی لاہور ہی سے ہے۔ باتوں باتوں میں اُنہوں نے لوگوں کی علم ناشناسی اور بے قدری کا شکوہ کیا۔ اس طرح کچھ وقت ان کے ساتھ گزرا۔ اجازت چاہی تو پھر ملاقات کے لیے وعدہ لیا۔ اور چلتے وقت اپنی کچھ مطبوعات عنایت فرمائیں۔ یہ میری ان سے پہلی ملاقات تھی۔

خالد صاحب سے رخصت ہو کر ہوٹل پہنچا۔ میرے ساتھی جن کے کام کے لیے مجھے جانا پڑا کہنے لگے کہ یہ سفر بھی بیکار گیا۔ اس لیے کہ ان کے کام کے جلدی ہونے کی کوئی توقع نہیں نظر آئی اور میں بھی کوئی خاص پر اُمید نہیں تھا۔

مجھے ایک دن کے لیے کراچی رکنا پڑا۔ اگلے روز جب دفتر پہنچا تو میری خوشی اور حیرانی کی کوئی انتہا نہیں تھی۔ Tax Holiday کی نوٹیفیکیشن جس کے لیے میرے موکل تقریباً دو سال سے پریشان تھے میری میز پر موجود تھی۔

اور اس پر خالد صاحب کے دستخط تھے۔ مجھے خالد صاحب کی مستعدی اور معاملہ فہمی کا یقین ہو گیا کہ باوجود ظاہری بے اعتنائی کے وہ معاملہ کی تہہ تک پہنچ گئے اور فیصلہ کرنے میں انھیں کوئی دقت نہیں لگا۔ وقت گزرتا گیا اور خالد صاحب ترقی کی منازل طے کرتے لاہور میں بطور کمشنر انکم ٹیکس تعینات ہو گئے۔ لاہور میں عبدالعزیز خالد صاحب کو قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا۔ اس وقت ان کی ذمہ داریاں انتظامی تھیں لیکن اس موقع پر بھی انہوں نے انصاف کے ترازو کو جھکنے نہیں دیا۔ جہاں بھی کسی ٹیکس گزار کے ساتھ کوئی زیادتی ہوئی اور یہ بات ان کے علم میں آئی آپ نے فوراً اس کا مداوا کیا اور ٹیکس گزار کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا۔ دفتر کا ماحول بھی ان دنوں نہایت شستہ اور پاکیزہ تھا۔ ہر شخص اپنے کام میں لگن دل جمعی اور خوش اسلوبی سے اپنا کام انجام دیتا اور کسی کو شکایت کا موقع نہ ملتا۔ ایسا ماحول ایک عادل حاکم کے زیر اثر ہی ہو سکتا ہے۔

سرکاری ملازمت میں انتظامی تبدیلیوں کا سلسلہ جاری رہتا ہے اور عبدالعزیز خالد صاحب بطور کمشنر انکم ٹیکس اپیلز تعینات ہو گئے۔ اب خالد صاحب کی ذمہ داری انصاف اور صرف انصاف تھی۔ اب ان پر نہ تو بجٹ پورا کرنے اور نہ ہی لوگوں پر جائز یا ناجائز ٹیکس لگانے کی ذمہ داری تھی ان کو تو اب صرف انصاف کرنا تھا۔

اپنے اس نئے عہدہ پر تعیناتی کے بعد خالد صاحب نے بھرپور انصاف کیا۔ اور جو ناجائز آمدن کسی مظلوم شخص کی تعین کر کے ٹیکس لگا دیا گیا۔ آپ نے اس سے پورا انصاف کر کے اس کو اس کا حق دلایا Taxation laws پر ان کو اتنا عبور حاصل ہے کہ قانونی اور پیچیدہ مسائل نہایت آسانی سے حل کر دیتے ہیں۔ آپ کے فیصلے بمصداقِ حق بحق دار رسید ہوتے ہیں۔ اپنے فیصلوں میں آپ کی انتہائی کوشش ہوتی ہے کہ کسی ٹیکس گزار سے ساتھ کوئی زیادتی باقی نہ رہ جائے۔

عبدالعزیز خالد صاحب شاید نئے سال کے اوائل میں اپنی سرکاری ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو جائیں کاش حکومت ان کی خدمات کو سراہتے ہوئے آپ کی مدت ملازمت میں توسیع کر دے۔ اور ہم ان کے عدل و انصاف سے مزید بہرہ ور ہوں۔

آپ کی جدائی کا خیال ابھی سے ایک بوجھ بن گیا ہے کہ ہم ایک منصف اور منکسر المزاج حاکم سے محروم ہو جائیں گے۔ آپ کی محکمہ انکم ٹیکس میں موجودگی ٹیکس گزار حضرات کے لیے ایک رحمت ہے اور انھیں یقین ہے کہ اگر ان کے ساتھ کوئی زیادتی ہو گی تو عبدالعزیز خالد صاحب ان سے پورا انصاف کریں گے۔

افضل آرشی

ایک پورٹریٹ

عبدالعزیز خالد بڑی جامع الکمالات شخصیت کے مالک ہیں، خوش رو، خوش لباس، خوش گفتار اور خوش رفتار جو کبھی کبھی برق رفتاری میں بھی بدل جاتی ہے۔ یوں کہ خالد صاحب باقاعدہ یوگا کرتے ہیں اور جب کبھی گاڑی خراب ہو یا عدم دستیابی کی کوئی صورت پیدا ہو جائے تو رکشہ، بس، ویگن میں سفر نہیں کرتے بلکہ پیدل چلنا زیادہ پسند کرتے ہیں اور پیدل بھی اس طرح کہ گلبرگ سے نابھہ روڈ تک کا سفر صرف آدھے گھنٹے میں طے کر لیتے ہیں۔ کوئی انھیں غامض اور ادق شاعر کہتا ہے تو کوئی عالم بے بدل۔ کسی کے خیال میں وہ شاہِ نثر ہیں تو کسی کے نزدیک جانِ غزل۔ قادرالکلام شاعر اور صاحبِ طرز ادیب ہونے کے علاوہ بہت بڑے سرکاری افسر بھی ہیں۔ بعض لوگ انھیں صرف اردو کا والد کہتے ہیں حالانکہ عربی بھی اُن کی اولاد میں شامل ہے اور ابھی تک اُنھوں نے عربی کو عاق نہیں کیا۔

خالد صاحب نے ہر صنفِ شاعری میں طبع آزمائی کی ہے اور ایک صنف تو مسلسل طبع آزمائی میں اتنی نازک بندھی ہے کہ صنفِ نازک ہو کر رہ گئی ہے۔ اب عالم یہ ہے کہ خواہش ہونے کے باوجود اُنھوں نے اس صنف میں طبع آزمائی کا خیال ترک کر دیا ہے۔ اب اس صنف سے اُن کا تعلق ضرور ہے مگر واجبی سا۔

خالد صاحب کی شاعری میں بارہ مسالوں کا مزہ ہے، قرآن کے منظوم ترجمے اور نعتیہ شاعری سے لے کر جنسی شاعری تک ہر قسم کا موضوع اُن کی شاعری میں در آیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے مداحوں میں ادیبوں اور شاعروں سے لے کر فلمی ایکٹرز اور ایکٹریسیں بھی شامل ہیں۔

خالد صاحب اپنی کتابوں میں جتنے سنجیدہ نظر آتے ہیں عام گفتگو میں اتنے سنجیدہ نہیں۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اُن کی گفتگو غیر سنجیدہ ہوتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ گفتگو نہایت دلچسپ اور لذیذ ہوتی ہے قہقہہ آور ہوتی ہے اس میں ہلکی ہلکی سنجیدگی کے ساتھ مزاح کی چاشنی بھی ہوتی ہے۔

اور کبھی کبھی تو ان کی گفتگو چٹخارے دار گفتگو کا درجہ اختیار کر لیتی ہے۔ خالد صاحب بعض اوقات جملے بازی بھی کرتے ہیں لیکن جملے کی خاطر بندہ ضائع نہیں کرتے بلکہ بندہ بچانے کی کوشش میں جملے میں ترمیم کر لیتے ہیں۔

گزشتہ چند سالوں میں اُردو ادب پر بے پناہ سانحے گزرے ہیں اور خالد صاحب کا کمال یہ ہے کہ

اُنھوں نے ہر سانحہ کو منظوم کر دیا ہے۔ جناب احسان دانش سے لے کر ڈاکٹر سید عبداللہ تک کون دانش ور ایسا ہے جس کا انتقال ایک سانحہ نہیں اور کون سا سانحہ ہے جسے خالد صاحب نے منظوم نہیں کیا۔ اُنھوں نے ایسی ایسی معرکۃ الآرا تعزیتی نظمیں لکھی ہیں جو کئی کئی مقالوں پہ بھاری ہیں مگر یہ سب کچھ اس تواتر سے ہُوا کہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے یعنی اُدھر کسی شخصیت کی رحلت ہوئی اُدھر خالد صاحب کے کرب نے نظم کا رُوپ دھارا۔ شاید اسی صورتِ حال کے پیشِ نظر ایک معاصر کو یہ کہنے کی ضرورت محسوس ہوئی کہ یوں لگتا ہے جیسے خالد صاحب ادیب کے مرنے کے انتظار میں بیٹھے ہوتے ہیں۔ اِدھر وہ مرا اُدھر نظم اخبار کی زینت بن گئی۔ کیا لازم ہے کہ مرنے والے کی خدمات کا اعتراف ان کے مرنے کے بعد ہی کیا جائے۔ اُس کی زندگی میں بھی تو خدمات کا اعتراف ہو سکتا تھا۔ بہرحال اس جملے کو یہاں درج کرتے ہوئے ہماری پوزیشن بالکل اُس ایڈیٹر کی ہے جو اپنے اخبار میں قارئین کے خطوط تو چھاپتا ہے مگر اُن کی رائے سے اتّفاق ضروری نہیں سمجھتا۔

خالد صاحب بہت کم لوگوں سے بے تکلّف ہوتے ہیں اور جن سے ہوتے ہیں اُن کی تعداد دو چار سے زیادہ نہیں۔ ان دو چار بے تکلّف دوستوں میں چوہدری غلام رسول ازہر۔ پروفیسر عثمان اور ڈاکٹر نصیر احمد ناصر شامل ہیں کچھ عرصہ پیشتر یہ چاروں دوست جمعے کی صبح کا وقت تقریباً ایک ساتھ گزارتے تھے۔ خوب گپ شپ ہوتی۔ قہقہے لگتے سرگوشیاں ہوتیں۔ جملے بازی ہوتی اور بعض اوقات بڑے بڑے راز ہائے سربستہ بھی منصّۂ شہود پر آتے مگر شائستگی کی سطح بہرطور برقرار رہتی لیکن جب سے چوہدری غلام رسول ازہر کے گھر چوری ہوئی ہے پروفیسر عثمان صاحب نے دوسری شادی کر لی ہے اور ڈاکٹر نصیر صاحب نے تحریک رحمۃٌ للعالمینی بنا لی ہے۔ یہ بے تکلّف محفل اُجڑ کر رہ گئی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ اب اس محفل نے "بزمِ ہم نفساں" کی صورت اختیار کر لی ہے جہاں سارے دوست تو شریک ہوتے ہیں لیکن ڈاکٹر ناصر صاحب شریک نہیں ہوتے پتہ نہیں اُن کی اہلیہ اُن کے ساتھ چلنے پر آمادہ نہیں ہوتیں یا وہ اہلیہ محترمہ کے بغیر گھر سے نکلنا خلافِ شرع خیال کرتے ہیں۔ کیونکہ "بزمِ ہم نفساں" کے اجلاسوں میں اگرچہ اکثر شوہر معہ بیویوں اور بیویاں معہ شوہر کے شریک ہوتے ہیں لیکن شوہر کے بغیر اور بیوی کے بغیر شوہر کی بھی سہولت ممنوع نہیں۔ بیشک جاوید طفیل اور سائرہ ہاشمی صاحبہ سے پوچھ لیجئے۔

خالد صاحب کا اصول ہے کہ وہ ادبی کتاب کا فلیپ یا پیش لفظ وغیرہ نہیں لکھتے۔ کیونکہ بقول ان کے فلیپ نگاری کے لیے جس قسم کی "فنّی مہارت" درکار ہوتی ہے وہ اُن کے پاس نہیں۔ اس کام کے لیے جو شاعر ادیب اُن سے رجوع کرتا ہے وہ اُسے مشورہ دیتے ہیں کہ اس سلسلے میں ملک کے معروف پیشہ ور فلیپ نگاروں سے رجوع کیا جائے اور اس مشورے کی کوئی فیس نہیں لیتے۔ بہرحال خواتین اس فیصلے سے مستثنیٰ ہیں کیونکہ حال ہی میں راولپنڈی کی ایک خاتون سفرنامہ نگار نے اپنے سفرنامہ پر اُن سے فلیپ لکھوا لیا ہے اور اب مزید خواتین کے لیے راستہ ہموار ہو گیا

ہے کہ وہ اگر چاہیں تو اپنی کتابوں پر خالد صاحب سے فلیپ لکھوا سکتی ہیں لیکن شرط یہ ہے کہ مصور اور تصویر دونوں دل کو کھینچتی ہوں۔

خالد صاحب کتابوں کی تعارفی تقاریب میں عام طور پر نہیں جاتے۔ وہ مشاعروں کو بھی وقت کا ضیاع تصور کرتے ہیں ان کے خیال میں یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے ایک بادشاہ اپنا دربار لگائے اور قصیدے پڑھوانے کے لیے قصیدہ خوانوں کو جمع کرے۔ مشاعروں کو بھی مجمع بازی خیال کرتے ہیں جبکہ ایک گروہ ایسا بھی ہے جو مشاعرے کو زبان و ادب کی ترویج کا ذریعہ قرار دیتا ہے اور اپنے حسن رضوی صاحب تو شاعروں کے اور بھی بہت سے فیوض و برکات کی نشان دہی کر سکتے ہیں۔ اس احساس کے باوجود خالد صاحب اُس مشاعرے میں ضرور شرکت کرتے ہیں جہاں انھیں بطور مہمان خصوصی مدعو کیا گیا ہو یا بطور صدر بلایا گیا ہو کیونکہ ان ہر دو حالتوں میں تقدیم و تاخیر کا مسئلہ کھڑا نہیں ہوتا۔ دوسری صورت میں یار لوگ کبھی کبھار ڈنڈی مار ہی جاتے ہیں۔

اچھی شکل اور اچھی تحریر دیکھ کر خالد صاحب بہت خوش ہوتے ہیں اور کھلے دل سے اُس کی تعریف بھی کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر اپنے ملنے والوں میں کسی کی بھی کوئی تحریر اخبار یا ادبی پرچے میں دیکھیں تو اُس سے اس کا ذکر کرنا نہیں بھولتے۔ اور عام طور پر تعریفی کلمات ہی کہتے ہیں۔ لیکن انہیں گلہ ہے کہ یار لوگ ایسا نہیں کرتے یعنی کئی کئی اخباری کالموں پر مشتمل ان کی نظمیں دیکھیں گے۔ کئی کئی صفحات پہ اُن کے مضامین اور اشعار پڑھیں گے مگر مجال ہے کہ دو لفظ تعریف کے بھی کہیں۔ بہر حال یہ اپنے اپنے ظرف کی بات ہے اور اس معاملے میں خالد صاحب کا ظرف واقعی قابل رشک ہے۔

خالد صاحب ناقابل یقین حد تک لکھتے ہیں اور حیرت انگیز حد تک مطالعہ کرتے ہیں۔ ادب کا کوئی موضوع ایسا نہیں جس پر اُنہوں نے لکھا نہ ہو یا اس کا مطالعہ نہ کیا ہو۔ ہر نئی کتاب اُن کی لائبریری میں موجود ہوتی ہے۔ اپنی تنخواہ کا بیشتر کتابوں کی خرید پر صرف کر دیتے ہیں صبح اپنے مطالعے کا آغاز اخبار سے کرتے ہیں۔ پیر پگاڑا کے بیانات سے لے کر انسانیت سوز سلوک تک کی تمام خبریں ایک ہی سانس میں پڑھ جاتے ہیں۔ خالد صاحب علم پھیلانے اور کتابیں جمع کرنے کے شیدائی ہیں۔ عام طور پر کتاب دینے سے گریز کرتے ہیں لیکن اگر کوئی بہ اصرار کتاب پڑھنے کے لیے بھی جائے تو اس کا پورا پورا حساب رکھتے ہیں اور کتاب کے واپسی کا تقاضا کرنا نہیں بھولتے۔ میرے خیال میں اس وقت خالد صاحب کی ذاتی لائبریری پاکستان بھر کی چند خوب صورت ذاتی لائبریریوں میں سے ایک ہے۔

اخبار و جرائد کے ایڈیٹر صاحبان خالد صاحب سے کسی نہ کسی تخلیق کا تقاضا کرتے ہی رہتے ہیں۔ اور سب جانتے ہیں کہ خالد صاحب لکھنے کے معاملے میں پوری طرح خود کفیل ہی نہیں بلکہ کئی خاندانوں کی آسانی کفالت بھی

خالد صاحب ذات کے چوہدری ہیں مگر پٹھانوں کی طرح بڑے مہمان نواز ہیں۔ دفتر میں آنے جانے والے احباب کے لیے چائے اور کافی کا باقاعدہ اہتمام رکھتے ہیں۔ اگر فضل من اللہ آجائیں تو لیڈیز فنگر بسکٹ" بھی منگوا لیتے ہیں مگر وہ دو روپے سے زیادہ نہیں۔ حالانکہ دو روپے کے بسکٹ تو فضل من اللہ کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتے۔ چائے میں دودھ ہمیشہ ڈبے کا استعمال کرتے ہیں۔ حالانکہ خالص دودھ کے شیدائی ہیں۔ پتہ نہیں خالص دودھ میسّر نہیں یا انہوں نے جان بوجھ کر اس کا استعمال ترک کر دیا ہے۔"

اوّل تو خالد صاحب سے اختلاف پیدا ہی نہیں ہوتا کیونکہ اختلاف ہمیشہ وہاں پیدا ہوتا ہے جہاں دونوں فریق سرگرمی سے گفتگو میں حصہ لے رہے ہوں لیکن خالد صاحب کے معاملے میں عام طور پر ایسا نہیں ہوتا اور اگر کہیں ایسا مرحلہ آ بھی جائے تو خالد صاحب کا لہجہ قدرے بدل جاتا ہے اور مخاطب کو فوراً مولانا کا لقب عطا کر دیتے ہیں۔

نئے لہجے کے پہلے جملے عام طور پر اس طرح ہوتے ہیں۔ "آپ بھی عجیب بات کرتے ہیں" آپ بڑے دلچسپ آدمی ہیں۔ یہ جملے عام طور پر دوبارہ استعمال کرتے ہیں اور جب تک مخاطب کا اختلافی رویہ تائیدی رویے میں نہیں بدل جاتا، تب تک وہ مولانا کے لقب ہی سے پکارے جاتے ہیں۔

ٹیلیفون پر عام طور پر مختصر بات کرتے ہیں مگر خواتین کا معاملہ دوسرا ہے سوئے اتفاق سے اگر کوئی رانگ کال آجائے تو "نہیں" کہہ کر ٹیلیفون اس انداز میں بند کرتے ہیں کہ رانگ کال کرنے والا ایک بار تو کم از کم ضرور سہم جاتا ہوگا۔ گفتگو عام طور پر السلام علیکم سے شروع کرتے ہیں اور عموماً (اچھی بات ہے۔ اچھی بات ہے) یا (شکر۔ شکر۔ شکریہ شکر) کے کلمات سے گفتگو کا اختتام کرتے ہیں۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ خالد صاحب اپنے دائیں بازو میں تانبے کا ایک کڑا سا پہنے رہتے ہیں۔ یہ وہ فیشن کے طور پر نہیں بلکہ ضرورتاً پہنتے ہیں۔ انہوں نے کہیں پڑھا ہے کہ اگر تانبا جسم سے مس کرتا رہے تو انسان کی جسمانی قوت و توانائی بیدار رہتی ہے۔

ہند و پاکستان میں خالد صاحب بے شمار لوگوں کی محبوب شخصیت ہیں۔ بعض اوقات انھیں اپنے مداحوں کے بڑے عجیب و غریب سوالات کا جواب دینا پڑتا ہے اور یوں وہ ایک عجیب سی الجھن کا شکار ہو جاتے ہیں۔ آج کل وہ ایک ایسی ہی مداح کے خطوط کے حصار میں ہیں جس نے انھیں حافظ، رومی، غالب و اقبال سے بڑا شاعر بنا دیا ہے۔ اُن کی یہ مداح ہندوستان کی معروف لکھنے والی عفت موہانی ہیں۔ انہوں نے انھیں خطوط میں خالد صاحب کے علاوہ عصرِ حاضر کے باقی تمام شعرا کو بالشتیے کہا ہے۔

خالد صاحب کی خواہش ہے کہ یہ خطوط شائع ہوں ان کے بعض خیر خواہ بھی انھیں ایسا کرنے کا مشورہ دے رہے ہیں لیکن ہم اس سلسلے میں اپنی رائے محفوظ رکھتے ہیں۔

کر سکتے ہیں۔ چنانچہ بغیر دخول ایڈیٹر صاحبان کو تبرک تقسیم کرتے رہتے ہیں لیکن تبرک لینے کے بعد ایڈیٹر حضرات کئی قسم کی پریشانیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں اُن کی پہلی پریشانی تو اُس وقت شروع ہو جاتی ہے جب چیز وقت مقررہ پر شائع نہیں ہوتی، دوسری پریشانی پروف پڑھنے کی ہے۔ خالد صاحب بلاشبہ بڑی فصیح اور بلیغ زبان لکھتے ہیں وہ اپنی ہر تحریر میں زیر زبر پیش اور اشداد کا خاص طور پر خیال رکھتے ہیں لیکن افسوس کہ اس جانب نہ کبھی ہمارے اخبار و جرائد نے توجہ دی اور نہ اُن سرکاری اداروں نے جنکے تحت بڑی بڑی موٹی کتابیں چھپتی ہیں چنانچہ وہ پروف پڑھنے کی ذمے داری کسی غیر ذمہ دار فرد پر نہیں ڈالتے کیونکہ وہ بارہا کتابت کی غلطیوں کا خمیازہ بھگت چکے ہیں۔ چنانچہ پروف یا دفتر منگوا لیتے ہیں اور یا متعلقہ پرچے کے دفتر جا کر خود پڑھتے ہیں اور خود غلطیاں اپنے سامنے لگواتے ہیں۔ تیسری پریشانی یہ کہ خالد صاحب بڑے اہتمام سے اپنی چھپنے والی چیز کا (آف پرنٹ) ضرور منگواتے ہیں تاکہ اپنی شائع ہونے والی چیز کے بارے میں حفاظتی تدابیر اختیار کر سکیں۔

خالد صاحب نے بڑی خود دار اور بے نیاز طبیعت پائی ہے۔ اللہ جس حال میں رکھے خوش رہتے ہیں بے شمار ادیبوں نے اُن سے معاصرانہ چشمک کے مظاہرے کیے ہیں اور بہت سوں نے تو اُن سے تعصب کی حد تک حسد کیا ہے مگر خالد صاحب نے کبھی کسی بات کا برا نہیں منایا وہ معترضین کی سطح پر کبھی نہیں اُترے اس لیے کہ اس طرح کرنے سے چھچھورے پن اور شرافت میں امتیاز باقی نہیں رہتا۔ وہ لگ بھگ چالیس کتابوں کے مصنف ہیں۔ متعدد جریدوں نے اُن کے فن اور شخصیت پر ضخیم نمبر شائع کیے ہیں۔ نثر کا کام اس کے علاوہ ہے۔

ایک دوست کے مطابق خالد صاحب کا کام اس قدر زیادہ ہے کہ اگر اسے سجاد باقر رضوی کی کمر پر رکھ دیا جائے تو رضوی صاحب کو کمر بچانی مشکل ہو جائے مگر افسوس کہ ایسا قدر آور شخص آج تک نہ پاکستان ٹیلیویژن کو نظر آیا اور نہ اکادمی ادبیات پاکستان کو توفیق ہوئی کہ وہ اپنی کسی کانفرنس میں خالد صاحب کو مدعو کر سکے۔ چونکہ پاکستان میں ہر قسم کی ناانصافی، ابتری اور بدامنی کے پیچھے کوئی خفیہ غیر ملکی ہاتھ کام کر رہا ہے۔ خالد صاحب کے معاملے میں بھی مجھے کوئی غیر ملکی خفیہ ہاتھ کارفرما دکھائی دیتا ہے۔

خالد صاحب کھانے کے معاملے میں بڑے کفایت شعار ہیں۔ دن میں صرف ایک بار یعنی دوپہر کو کھانا کھاتے ہیں صبح صرف شہد کا چمچہ لیتے ہیں اور شام کو تو کچھ بھی نہیں کھاتے اگرچہ اُن کے آگے انواع و اقسام کے کھانے چن دیے جائیں۔ امرود "آبوسٹ" سیب اور آم بڑی رغبت سے کھاتے ہیں۔ امرود تو باقاعدہ کاٹ کر مرچ مصالحے کے ساتھ کھاتے ہیں لیکن سیب اور آم کے معاملے میں چھری کانٹے کا تکلف نہیں کرتے۔ کہتے ہیں جو مزہ سالم میں ہے تقسیم میں کہاں۔

معین تابش

کِتنا عظیم ہے تُو

اشعار تیرے پڑھ کر
محسوس یہ ہُوا ہے
خُوشبو کا شہر ہے تو
رنگوں کا ہے پیمبر

موجِ نسیم — تیرے
گھر کی کنیز جیسے
خوش رنگ چیز جیسے
لفظوں پہ راج تیرا
مضمون دست بستہ
مفہوم — گھر کا دربان
تیرا شعور ہم سے
کرنوں کا تاج مانگے
فن کا خراج مانگے

دُکھ درد کے نگر میں
دُنیا کی رہگزر میں
اے دوست فکر تیری
برگد کی چھاؤں جیسی
صحرا میں گاؤں جیسی

احساس کے سفر میں
خُوں کے دِئے جلائے
ہاتھوں میں چاند تازے
ہونٹوں پہ ان کہی سی لاکھوں حسین باتیں
ابرُو کے ایک خم پر
قُربان چاند راتیں
جلتی ہوئی فضا میں
تپتے ہوئے جہاں میں
موجِ نسیم ہے تو
رقصِ شمیم ہے تو
عبدالعزیز خالد
کِتنا عظیم ہے تُو!

فکر و فن

شورش کاشمیری

عربی زبان کا اردو شاعر

حضرات! یہ دلچسپ مجلسِ مذاکرہ جو حضرت احسان دانش کی صدارت میں عبدالعزیز خالد کی شاعری پر گفتگو کرنے کے لیے منعقد ہوئی ہے اور جس میں ہمارے کئی فاضل دوستوں نے اظہارِ خیال کیا ہے، اس اعتبار سے ایک عمدہ مجلس کہی جاسکتی ہے کہ

۱۔ جو چہرے اس تقریب میں موجود ہیں وہ علم و قلم کے میدانوں میں اور نہیں تو پچھلے پندرہ بیس سال سے خصوصیت رکھتے ہیں۔

۲۔ جس انداز میں بحث و نظر اور نقد و بیان کا اظہار ہوا وہ خاص ادبی تھا۔ اور اس میں حصہ لینے والے دوستوں نے ثابت کیا کہ وہ اس بحث میں گفتگو کرنے کے اہل اور مجاز ہیں۔

۳۔ ہمارے یہ دوست شاعری سے متعلق بلکہ خصوصی رکھتے ہیں اور جانتے ہیں کہ اردو شاعری اور فارسی شاعری کی تاریخ کیا ہے؟

۴۔ میں نے ان سے کوئی بات یا بول سُنا نہ محسوس کیا جو غیر معیاری اور محض الفاظ کی مینا کاری ہو۔

۵۔ البتہ ایک چیز جو میرے محسوسات کا حصہ ہے اور اس مجلس میں مجھے اس کا شدید احساس ہوا وہ یہ ہے کہ نوجوان دوستوں نے مغرب کے معیارِ تنقید میں ڈوب کر مشرق کے افکار کی پرکھ کی ہے عبدالعزیز خالد کی شاعری ایک خاص مزاج رکھتی ہے۔ اُس کا اظہار، اسلوب، زبان، مزاج، بلکہ طبیعت یا یہ کہہ لیجئے کہ سراپا مشرقی اور مشرقی بھی مذہب کے سانچہ میں ڈھلا ہُوا ہے۔ وہ نہ صرف اپنے مضمرات و محرکات کے اعتبار سے اسلامی ہے بلکہ بزم ہے، تو اس میں قرنِ اوّل کی صحبتوں کا عکس ہے اور رزم ہے تو اس پر غزوات کا پرتو ہے۔ اس اثاثے کو ہم مغربی تنقید کی ترازو میں تولنا چاہیں تو ہم یورپ کی بعض علمی صداقتوں کے باوجود خالد اور ان کی شاعری سے انصاف نہیں کر پائیں گے۔ مسئلہ ان کی شاعری سے متعلق محض زبان و بیان، یا فکر و تخیل کا نہیں، بلکہ مجھے کہنے کی اجازت دیجئے کہ سمع و بصر کا بھی ہے۔

۶۔ میں بہت دنوں سے خالد کی شاعری پر قلم اُٹھانے کا ارادہ کر رہا ہوں، اور اس کے وجوہ ہیں۔ لیکن صرف اس لیے رُکا ہُوا ہوں کہ:

ابھی شاید اس کے لیے وقت نہیں آیا۔

ب۔ خالد میرے نزدیک عظیم ماضی یا عظیم مستقبل کے شاعر ہیں، ماضی کہہ چکا ہے اور مستقبل اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کے انتظار و تعاقب میں ہے۔

ج۔ میری صحت بہت دنوں سے نئی نسلوں کے افکار کی طرح متزلزل ہے، قابو ہی میں نہیں آتی۔

بہر حال یہ ایک دوسرا تذکرہ ہے اور بقول غالب ؏

کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے

جو بات مختصراً مجھے کہنا ہے کہ احسان صاحب کی فرمائش بھی ہے اور نفسِ مضمون کا اقتضاد بھی یہی ہے وہ دو فاضل دوستوں کا نقطۂ نگاہ ہے، جس کی تائید بعض دوسرے نوجوانوں نے بھی کی ہے۔ فرماتے ہیں کہ:

"عبد العزیز خالد کے خیالات کے عمق سے اُن کی عظمت کا احساس ضرور ہوتا ہے، لیکن اُن کی زبان اتنی مشکل ہے کہ عوام سے ہٹ گئی ہے۔ وہ مغلق زبان لکھتے اور لُغت کے سینا سے ہم کلام ہوتے ہیں۔"

بظاہر یہ اعتراض؟ لیکن اعتراض نہیں؟ اظہار غلط نہیں۔ فی الواقعہ عبد العزیز خالد سنگین و رنگین زبان استعمال کرتے اور الفاظ کو پاتال سے نکال کر لاتے ہیں۔ ان میں خاصی حد تک عوام کالانعام کے لیے میر کا نشتر، غالب کا عشوہ، حالی کا وعظ، اکبر کی طنز، داغ کی رندی، جگر کی سرمستی، اختر شیرانی کی سرخوشی، احسان کی شوخی، جوش کی نقارہ زنی اور فیض کا داغدار اُجالا نہیں ہے۔ لیکن اُن کی شاعری کو ہم ایسے کسی ترازو میں تول نہیں سکتے جو ان کے افکار کا پیمانہ نہیں ہے۔ ؏ ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است

بعض چیزیں تولی جاتی ہیں، بعض ماپی جاتی ہیں اور بعض پرکھی جاتی ہیں۔ خالد کی شاعری تول اور ماپ کی شاعری نہیں۔ پرکھ کی شاعری ہے۔ اور اگر اس کا تولنا اور ماپنا بھی انتقادِ سخن میں ہے تو اس کے لیے ایک دوسری ترازو ہے۔ آپ اُس کو داغ و جگر، حالی و اکبر اور جوش و فیض کی ترازو میں تول کر اس کے صحیح وزن سے آگاہ نہیں ہو سکتے۔

عبد العزیز خالد عربی زبان کا اُردو شاعر ہے، بالکل اسی طرح جس طرح مولانا ابو الکلام آزاد عربی زبان کے اُردو ادیب تھے۔ اس قسم کے لوگ محض فن کے لیے پیدا نہیں ہوتے۔ فن ان کا جادہ اور منزل ان کی فکر ہوتی ہے۔ اقبال نے کہا تھا کہ لوگ مجھے شاعر نہ بھی سمجھیں تو مجھے اس کی پرواہ تک نہیں، میرا مقصد وہ خیالات ہیں جو میں مسلمانوں کی تجدید و احیاء کے لیے پیش کر رہا ہوں۔

عبد العزیز خالد ہیں جیسا کہ آپ نے بھی تسلیم کیا، ایک بڑے شاعر کے تمام اوصاف، محاسن،

آداب اور آثار موجود ہیں۔ وہ کسی مرحلے یا موڑ پر بھی قلم کی ٹھوکر نہیں کھاتے یا اُن کے ہاں عروض کی ذرہ برابر جھول نہیں۔ لیکن اُن کا اصل شاعری نہیں وہ مواد ہے جو اُن کے کلام کی اصل رُوح اور بیان کی حقیقی غایت ہے۔

وہ دبستانِ اقبال کے رُکن ہیں جو قافلۂ اقبال نے مرتّب کیا، اُس قافلے کے سب سے زیادہ پُرآہنگ اور سیف بدست (عصا بدست نہیں) حدی خواں ہیں اور اگر میں یہ کہوں تو غلط نہ ہوگا کہ اقبال کی آرزو ہیں۔ جو لوگ اُن کے افکار کی جولان گاہ سے واقف ہیں، وہ جانتے ہیں کہ عبدالعزیز خالد اپنے نصب العین کا سفر، زبان کی اس وادی ہی میں کر سکتے ہیں، جس میں کر رہے ہیں، کوئی دوسری وادی اُن کی منزل کو نہیں جاتی۔ وہ اس قسم کے شاعر ہیں جو عوام کے دماغوں میں تخیل کا سفر نہیں کرتے خود اپنے دماغ میں اپنی تنہائی لے کر قدم اُٹھاتے اور جبلِ عمر پہ کھڑے ہو کر صدا دیتے ہیں۔

عزیزانِ محترم! ہر چیز کا لباس ہوتا ہے۔ خود انسانوں کے لباس میں اختلاف ہے، ملکوں کے لباس میں اختلاف ہے، قوموں کے لباس میں اختلاف ہے۔ پھر زن و مرد، جوان و ضعیف اور بچّے اور لڑکے کے لباس میں اختلاف ہے۔ دُولہا، کبھی دُلہن کا لباس نہیں پہنتا۔ آپ غور کیجئے کہ خالد کی شاعری کو فیض کی شاعری کا اور فیض کی شاعری کو خالد کی شاعری کا لباس نہیں پہنایا جا سکتا۔ پہنا کر دیکھ لیجئے دونوں حدودِ جامہ زیبی سے خارج ہوں گے۔

عبدالعزیز خالد جو کہنا چاہتے ہیں یا کہہ رہے ہیں اُس کی زبان وہی ہے جو خالد کے قلم کی میراث ہے۔ ہمارے انتقاد کی نوعیت یہ ہے کہ:

ہم معبد و میکدے میں امتیاز نہیں کرتے اور لہو و لعب کی راتوں کا لہجہ لے کر اعتکاف کی راتوں پر تبصرہ کرنا چاہتے ہیں۔

آغا صاحب نے خالد کی شاعری کے مختلف پہلو بیان کرتے ہوئے کہا جو لوگ ادب میں مجتہد ہوتے یا اپنے سامنے فکری نصب العین رکھتے وہ عوام کی زبان میں گفتگو نہیں کرتے۔ اُن کے الفاظ، مطالب، افکار اور رشحاتِ عوامی سطح سے بلند ہوتے اور عوام سے ہم کلام ہونے کے لیے وہ عبقری طبقے کو خطاب کرتے ہیں اور پھر اس طبقے ہی کی معرفت عوام میں ان کی فکر ایک تحریک بن کر ذہنی عصبیتوں کو پروان چڑھاتی اور ملی ولولوں کو طوفان بناتی ہے

آغا صاحب نے کہا، خالد کی زبان اور خالد کے تخیّل پر یہاں جن دوستوں نے یہ کہا ہے کہ وہ شاعر تو عظیم ہیں اور اندازہ ہوتا ہے کہ ایک بڑا شاعر اپنے سینائے افکار پر لن ترانی کی صدا دے رہا ہے مگر اُن کے الفاظ مشکل و مغلق ہیں اور اس کے تخیّل کی گزرگاہ پُرپیچ اور عمومی فہم سے ماوریٰ ہے۔ آخر اس طرح وہ کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں؟

ایک دوست نے کہا کہ یہ زمانہ کارل مارکس کی جدلیات کا ہے اور آج کل عظیم شاعر وہ عظیم شاعر ہے جو عوام کی زبان میں گفتگو کرتا اور عدم طبقاتی سماج کے لیے شعر و ادب کے میدانوں میں گونج اور گرج پیدا کرتا ہے۔ میں اپنے اس دوست سے یہ سوال کرنے میں حق بجانب ہوں کہ شاعری فن ہے۔ یا پروپیگنڈہ؟ آپ کو شاعری میں اشتراکیت کا پروپیگنڈہ کرنے کا حق تو حاصل ہے لیکن شاعری محض اشتراکیت کے تابع نہیں اور نہ جدلیات کے تحت دعویٰ، تضاد، ترکیب کا جامہ اُس کو پہنایا جا سکتا ہے۔ اگر آپ کی منطق کو تسلیم کرتے ہوئے عوامی زبان ہی کو معیار مان لیا جائے تو سوال ہے کارل مارکس کی تصنیف سرمایہ کس قدر لوگ سمجھتے ہیں۔ کیا وہ عوام کی زبان میں ہے اور عوام اُس کے مباحث و افکار سے براہ راست آگاہ ہیں؟ وہ شاعر جو اشتراکیت کے مبلغ ہیں جدلیات سے واقف ہیں؟ سردار جعفری یا کیفی اعظمی اشتراکیت کے بڑے شاعر اور قرار دیئے گئے لیکن اُن کے کلام نے کس معاشرے کو متاثر کیا اور کس جدّوجہد کو آب و دانہ بخشا؟ حقیقت یہ ہے کہ سردار جعفری اور کیفی اعظمی کی شاعری عوام کے لیے زبان کے اعتبار سے کسی قدر سریع الفہم ہونے کے باوصف مطالب کے لحاظ سے کسی بھی معنوی تاثیر کی حامل نہیں اور نہ اس باب میں سریع الفہم ہے۔ وہ شاعری کے نگارخانہ کا ایک بدمزہ سین ہے۔ البتہ فیض احمد فیض اشتراکی زبان کے عظیم شاعر ہیں اور اُن کے کلام و بیان میں رعنائی و زیبائی بھی بدرجہ وافر ہے۔ لیکن وہ چونکہ معاشرے کی بے چینی کے شاعر ہیں اور نئی نسلیں اس بے چینی کا سب سے بڑا شکار ہیں اس لیے وہ جذباتی اعتبار سے انھیں اپیل کرتے اور اُن کے اذہان میں معاً اُتر جاتے ہیں مگر اُن کے کلام میں اغلاق بھی ہے اور اہمال بھی۔

آغا صاحب نے اس مبحث کی صراحت کرتے ہوئے کہا، ادبی شاعری فلمی شاعری نہیں ہوتی اور فکری شاعری بدنی شاعری نہیں ہوتی۔ وہ لوگ جو وصل و ہجر اور کاکل و رخسار کی مجتیں تلاش کرتے ہیں اُن کے لیے داغ دہلوی کے ہاں بہت کچھ ہے، اختر شیرانی بھی ان کے لیے ایک مینا بازار رکھتے ہیں۔ لکھنؤ، دہلی، آگرہ، وغیرہ مدّتوں اس بدنی شاعری کے سب سے بڑے صناع رہے ہیں۔ لیکن اس قسم کی شاعری سب کچھ ہو سکتی ہے، فکری نہیں ہو سکتی۔ قوموں کی ذہنی سرگزشت کا انحصار فکری شاعری پر ہے، جس سے ملّت پیدا ہوتی، عقیدے کو جِلا ملتی اور قومی وحدت جوان ہوتی ہے۔

اگر سوال محض عوام کی زبان کا ہے تو وہ زبان غالب کے ہاں بھی نہ تھی لیکن وہ آج تک غزل کا سب سے بڑا شاعر ہے۔ حالی نے سادہ زبان اختیار کی لیکن عوامی زبان نہیں۔ اقبال عوامی زبان سے منزلوں دُور ہیں اور جوش جیسا لاابالی رند عوامی زبان میں شاعری نہیں کرتا۔ اُس کے کلام کا بڑا حصّہ لغت کی شعبدہ بازی ہے اور نصب العین اُس کا محض بدن کا عیش اور نفس کا لعب ہے۔ وہ جوش مدّت ہوئی

مرچکا جو انقلاب کی نراجی صدائیں بلند کرتا تھا۔

وہ لوگ جو عبقری ہوتے اور قدرت انھیں کسی دعوت کے لیے مامور کرتی ہے وہ کبھی اپنے دماغی شکوہ کو ترک نہیں کرتے اُن کے لیے سب سے بڑا عیب عوام کا لہجہ اور بازار کی زبان ہوتی ہے۔ داغ تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ ؎

مُنہ کی بھی ملے تو رداہے شباب میں

لیکن خالد ایسی زبان کے استعمال کا تصور ہی نہیں کر سکتے اُن کے لیے قلم کی جانکنی ہے۔

مختصراً یہ کہ خالد جس دعوت، تحریک، فکر، موقف، یقین، اعتقاد اور نظر کے شاعر ہیں، اگر وہ اپنی زبان چھوڑ دیں اور ان الفاظ کو استعمال نہ کریں جو ان کے کلام کے شکوہ کی معراج ہیں۔ تو وہ نہ اپنے افکار کو آواز دے سکیں گے اور نہ اپنے تخیل کو اُجال سکیں گے۔

اذان کو عربی کے بجائے اُردو میں ڈھال بیجیے اور مسجدوں میں پانچوں وقت پکار دیئے، مفہوم وہی ہو گا لیکن اثر کچھ نہ ہو گا بلکہ ایک مضحک چیز پیدا ہو جائے گی۔ خالد کی شاعری کا رنگ اُس کے الفاظ میں، ترنگ اُس کے مطالب میں اور اُمنگ اُس کی روح میں ہے۔

معیار یہ ہونا چاہیئے کہ جو چیز ہمارے سامنے پیش کی جا رہی ہے وہ مطالب سے محروم تو نہیں۔ اُس کا اُسلوب صحیح ہے یا غلط؟ خالد کے مطالب سے بھی کسی کو انکار نہیں اور اُسلوب میں بھی کلام نہیں تو پھر اعتراض کیا ہے کہ وہ اسلام کی بات کرتے اور اسلوب میں اس قدرت تامہ کو مضمحل نہیں کرنے دیتے۔

جو نظم آزاد و نظم معریٰ کے ہتھے چڑھ کر مضمحل ہو گی   اگر نظم آزاد کا اہمال اور نظم معریٰ کا ابہام اپنے اندر معانی رکھتا ہے تو وہ لوگ جو اسلامی مصطلحات، اسلامی کنایات، اسلامی روایات اور اسلامی آیات کو اپنے کلام و بیان میں اپنے معاشرے کی مخاطبت کے لیے استعمال کرتے ہیں وہ کس رُخ سے خیالات کی بھول بھلیّاں اور افکار کا بعید از فہم طلسم خانہ تیار کرتے ہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ اس فکر کے معترضین فرائیڈ اور مارکس سے اس حد تک متاثر ہیں کہ ان پر اُردو کی وہ کہاوت صادق آتی ہے۔ کوّا چلا ہنس کی چال اپنی چال بھی بھول گیا۔ اس قسم کے شاعروں اور نقادوں کے ہاں اپنے معاشرے، اپنے دین، اپنے نظریہ، اپنی زبان اور اپنی روایت کا پرتو تک نہیں۔ یہ لوگ تقلید، اخذ اور توارد پر اپنے فکر و فن کی زندگی بسر کرتے ہیں اور ان کے نزدیک بھوندے پن کا نام ادب ہے۔ ان کا ہر نعرہ مستعار ہے۔ وہ کسی عالمی ادب کے ترجمان ہوں تو الگ بات ہے۔ لیکن جس قوم میں اُن کا وجود ہے اور جس ملت کے اعضاء ہیں۔ اُس سے اُن کے کلام و بیان، اور معنی و فکر کا ذرّہ برابر رشتہ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ غیر ملکی نعرہ بازی سے جو ادب پیدا ہوا تھا۔ وہ دوسری جنگ عظیم کے بعد چند سال زندہ رہا۔ جب برِّعظیم آزاد ہو گیا تو اس کی عمارت دو چار سال میں اس طرح منہدم ہو گئی کہ اب اُن کی شاعری اور افسانہ دونوں مر چکے ہیں۔ لیکن وہ جسمانی طور پر

زندہ ہیں۔ اس سے بڑا المیہ کیا ہو سکتا ہے کہ شاعر جسمانی طور پر زندہ ہو اور اُس کا کلام اُس کی زندگی ہی میں مر جائے۔ ہمارے نعرہ باز شاعروں کی پوری جماعت پر یہی بنتی ہے۔ اگر ان میں سے دو چار زندہ ہیں تو وہ اپنے رفقاء کے انجام کی طرف قدم اُٹھاتے چلے جا رہے ہیں۔ اُن کی موت کا ایک سبب یہ ہے کہ اُنھوں نے اخلاقیات سے بغاوت کی۔ نتیجہ معلوم ہوا کہ اخلاقیات کو نظر انداز کرنے والے حیات کو بھی نظر انداز کر دیتے ہیں۔ آخر ان لوگوں کو اندازہ ہو گیا کہ ان کی ادبی تحریک سے نہ تو تاریخ کی رفتار تیز ہوئی ہے اور نہ اُن کی گوشہ نشینی سے سُست ہوئی ہے۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی نے ایک دفعہ کہا تھا کہ نئے اور پرانے ادب میں اتنی مغائرت نہیں جتنی نئے اور پرانے ادب کے علمبرداروں میں ہے۔ اس مخالفت ہی کا نتیجہ ہے کہ ہماری نئی پود جس نظامِ تعلیم کے سانچہ میں ڈھلی ہے اُس نے اس ساری پود کو اپنے ماضی کی عظیم روایتوں اور اپنی ملّت کے مستقبل کی عظیم خواہشوں سے بیگانہ کر دیا ہے۔ اس کے نزدیک اسلام ایک ازدست رفتہ طاقت اور اُس کی زبان ادق و مغلق الفاظ کا مال متروکہ ہے، غرض ہمارے ادبا و شعراء نے جو مال غیر ملکی افکار کی منڈی سے درآمد کیا ہے وہ سب کچھ ہو سکتا ہے لیکن اس قوم کا ورثہ نہیں۔ اور نہ اس قوم کے افراد کو اس سے دلچسپی ہے۔ یورپ کی تجارت کا راز یہ ہے کہ جو چیز بیچنا چاہتے ہو اُس کے لیے ضرورت یا مانگ پیدا کرو۔ ہمارے ان اہلِ قلم نے مال برآمد کر لیا اور اس کی کتھا بیان کرنا شروع کر دی لیکن عوام میں نہ مانگ پیدا کر سکے نہ ضرورت کا احساس! کسی نئی تحریک کو اتنی جلدی "مرگِ ناگہاں" کا شکار نہیں ہونا پڑا جتنی جلدی ان کے شعر و ادب کی "جواں مرگی" سامنے آتی ہے۔

ان لوگوں نے جو کچھ کیا اور نئی پود کو ذہنی اعتبار سے جس ویرانی کے سپرد کیا اس پر تاسّف ضرور ہے، تعجّب نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اُن کا ادب محض نقّالی تھا، جو لوگ اس ادب پر اصرار کرتے ہیں وہ آگ اور لہو سے گزرے نہیں بلکہ آگ اور لہو کے تماشے کی تجارت کرتے رہے۔ نتیجۃً خود کو تماشا ہو کر ختم ہو گئے۔ ان کی مثال اُس انسان کی ہے جو فی نفسہٖ احساسِ کمتری کا مریض ہو اور دوسروں کے محاسن کو عیوب میں ڈھالتا رہے۔ اُن لوگوں نے اپنے دَور کے ہر عظیم شاعر کو بزعمِ خویش نظر انداز کیا، ان کے افکار پر رجعت کی پھبتی کسی، اُس پر فرار کا الزام لگایا، گریز کا طعن دیا اور نقد و نظر کی چھُری چلائی۔ امام حسین علیہ السّلام کا مرثیہ ان کے نزدیک رجعت گوئی تھی، لیکن جب سٹالن کی موت ہوئی۔ تو اس کے نوحے ان کے نزدیک ادب کی معراج تھے۔ جب ادب کی ترازو اس طرح ہو اور انتقاد کا پیمانہ اس کا انداز کا ہو تو ادب و شعر کی قدریں خود بخود مسخ ہو جاتی ہیں۔

آغا صاحب نے پروفیسر رشید احمد صدیقی کے حوالے سے کہا کہ ایسا ادب جس کا مدار تمام تر

گاہک کی کمزوری پر ہو ، مال کی خوبی پر نہ ہو ، وہ اس لیے اَدب نہیں کہلا سکتا اور تاریخ میں اس کے لیے مستقل جگہ نہیں ہو سکتی کہ اُس کے ساتھ دوستوں کی ایک انجمن ، اخباروں کی ایک جماعت اور ماہناموں کا ایک لشکر ہے ۔ ایسا ادب یا تو شہوانیات کی بوالہوسی ہے یا سیاست کی ہلٹربازی۔ اس کے علاوہ اور کوئی ہی خوبی اس میں نہیں ہے ۔

آغا صاحب نے کہا ، مارکسی ادب یا فرائیڈی اَدب کے علمبردار اپنے دعاوی میں ہمیشہ بلند بانگ نظر آتے ہیں لیکن جب کبھی ان کی تحریر ، تقریر سامنے آتی ہے تو اس میں اپنے مکتبِ فکر کے کسی شاعر یا نقاد کا حوالہ نہیں دیتے۔ ان کے نوکِ زبان ہمیشہ اُن شعراء کے اشعار ہوتے جو ان کے تذکروں میں کوئی جگہ نہیں رکھتے ، پھر زبان و بیان میں زور پیدا کرنے کے لیے وہ اپنے کسی شاعر یا ادیب کا شعر و مقولہ نقل نہیں کرتے ۔ نقل کرنے کے لیے انہیں اپنی صف سے باہر کے لوگ ملتے ہیں ۔ ان کی اپنی خوبی بس اتنی ہے کہ عوام سستے اور کافی مسکرات چاہتے اور یہ سستی اور کافی شہرت کی تلاش میں رہتے ہیں ۔

آغا صاحب نے موضوع کو سمیٹتے اور موڑتے ہوئے خالد کی شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے کہا ، ہر آرٹسٹ کی عظمت : کا انحصار اُس کے موضوع کی عظمت پر ہے ۔ خالد نے ایک عظیم تاریخ ایک عظیم عقیدے اور ایک عظیم روایت کی پشتیبانی کی ہے ۔ وہ اس سمندر کے ایک بڑے غواص ہیں ۔ اقبال نے ثنائی کے ادب سے لولوئے لالا نکالے تھے ۔ خالد نے اقبال کے ادب سے گوہر آبدار پیدا کئے ہیں ۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ اس وقت اقبال کے مدرسۂ فکر کی ایک پُرعزم شخصیت ہیں ۔ اُن کے کلام پر اقبال کی فکر نہیں تو آرزو ضرور چھائی ہوئی ہے ۔ وہ ہمیں اس ماضی کی طرف لے جانا چاہتے ہیں جسے کھو کر ہم حال کے ویرانہ میں مستقبل سے مایوس ہیں ۔ شعر میں جذبہ و خلوص ہو تو وہ کبھی نہیں مرتا ۔ ہمیشہ زندہ رہتا اور مستقبل اُس سے توانائی حاصل کرتا ہے ۔ تخیل زمان و مکان کا پابند نہیں ۔ وہ ہمیشہ سے ہمیشہ کے لیے اور عقل سے کہیں زیادہ قدیم و قوی ہے ۔

خالد کی شاعری نے ادب میں جو رونق پیدا کی اُس کے اساسی خطوط ہیں کہ

۱ ۔ خالد نے اقبال کی فکر اور آرزو کا تسلسل قائم رکھا ہے ۔ اقبال کی شاعری کیا ہے ؟

۱ ۔ خودی کا نشو و استحکام ۲ ۔ مغرب پر تنقید ۳ ۔ عشق و عقل کے معرکہ میں عشق کی فتحمندی ۔ ۴ ۔ توحید و رسالت سے لگاؤ میں اسلام سے غیر متزلزل وابستگی ۔ ۵ ۔ مشرق کی نشاۃ ثانیہ بالفاظِ دیگر اسلام کے عظیم ماضی کا احیاء ۔

عشق اور اسلام سے متعلق اقبال کی فکر اور آرزو کو خالد نے اپنایا اور بڑھایا ہے ۔

۲ ۔ خالد نے برِعظیم میں اسلام کی اُس زبان کو متروک نہیں ہونے دیا جو معناً ہمارا قومی

ورثہ اور معنوی رُوح ہے اور جس کی بساط پیٹنے میں انگریزی پیش پیش رہی ہے اور اب صوبائی عصبیتیں گل کھلا رہی ہیں یا کھلا چکی ہیں۔

۳۔ خالد کی شاعری میں طور سینا سے لے کر بیت اللہ تک کی آواز ہے۔

۴۔ خالد نے بہت سی نئی ترکیبیں اور الفاظ کا برجستہ حسن شاعری کو مہیا کیا ہے۔

۵۔ اُن کی شاعری میں ایک لحن اور ایک آہنگ ہے جو ہمیں کبھی محور اور کبھی مرعوب کرتا ہے۔

۶۔ وہ ادب برائے زندگی اور ادب برائے ادب کا ایک ایسا امتزاج رکھتے ہیں کہ ان کی شاعرانہ عظمت دل و دماغ میں اُترتی چلی جاتی ہے۔

۷۔ شاعری کے دونوں وصف ابلاغ و ایجاز ان کی شاعری کا حقیقی جوہر ہیں۔

۸۔ اُن کی شاعری نہ شرارت ہے نہ سیاست نہ تجارت، فی الجملہ ایک عبادت ہے۔

۹۔ وہ ادراک کی صحت، احساس کی شدت، جذبہ کی واقعیت، تجربہ کی روایت کے سحر طراز شاعر ہیں۔

"عبدالعزیز خالد، پاکستان میں اسلام کے شاعر ہیں وہ اُن روایتوں کے وارث ہیں جو حالی، شبلی، اور اکبر الٰہ آبادی سے منتقل ہو کر علامہ اقبال نوّراللہ مرقدہٗ کی فکر میں جلوہ نما ہوئیں۔ اور حقیقتاً قرآن و سیرت کا اُردو شاعری میں اظہار تھا۔ خالد علامہ اقبال کی آرزو ہیں۔ اُن کے افکار حکیم مشرق کے نورِ بصیرت سے مستنیر ہیں۔ اُن کا لہجہ رزمیہ اور الفاظ پُرجوش ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ شبلی، اقبال، ظفر علی خاں اور محمد علی جوہر کی شاعری سے عناصرِ اربعہ لے کر مسلمانوں کی متوقع نشاۃ ثانیہ کا نعرۂ رستخیز ہیں۔ ان کی شاعری مسلمانوں کے تاریخی ضمیر کی نمائندہ ہے۔ وہ مشکل گو نہیں۔ ہم جس زبان سے محروم ہو چکے ہیں، وہ اس کی آواز ہیں۔ یہی زبان کم سے کم نو صدی تک مسلمانوں کی زبان رہی ہے۔ ان لوگوں کو خالد کی شاعری پر تبصرہ کرنے یا نقد و بحث کی عمارت اُٹھانے کا حق نہیں پہنچتا جو اسلام کی تاریخ سے، نا بلد، قرآن کی رُوح سے ناواقف اور سیرتِ نبویؐ کی عظمتوں کے شناسا ہی نہیں ہیں۔ خالد پاکستان کی مسلمان قوم کے شاعر مستقبل ہیں۔ وہ اُس شاہراہ کی جانب پکارتے ہیں جو مسلمانوں کے ماضی کو جاتی اور فی الواقعہ ان کے مستقبل کا سنگِ میل ہے۔"

سوالات و جوابات

شفیق کوٹی: خالد کی شاعری اور عوام کی نہاد میں اثر پذیری کے اعتبار سے کس حد تک مطابقت ہے؟

شورش کاشمیری: آپ کے سوال کی تہ واضح ہے۔ اپنا جواب چاہنے سے پہلے آپ بتا سکیں گے کہ غالب کی شاعری اور عوام کی نہاد میں مطالب آشنائی کے اعتبار سے کس حد تک مطابقت ہے۔

کسی فن کی عظمت کا مدار عوام کی تحسین پر نہیں بلکہ اُس کی گہرائی اور گیرائی پر ہوتا ہے۔ آخر عوام میں کتنے ہیں جو ضربِ کلیم اور بالِ جبریل کے مطالب سے آگاہ ہیں۔ غالب و اقبال عوام کے نہیں، خواص کے راہنما تھے۔ ان خواص نے عوام کی سیادت کی۔ خالد عوام سے کہیں زیادہ انہی خواص کے شاعر ہیں جو عوام میں اسلام کے داعی ہیں۔ خالد کی شاعری بالفاظِ دیگر اسلام کی شاعری ہے، عوام کی شاعری نہیں۔

اطہر مسعود: خالد کی شاعری ایک ادبی مجتہد کی حیثیت سے کیا مقام رکھتی ہے؟

شورش کاشمیری: میں نے اپنی تقریر میں اسی سوال کا جواب دیا ہے۔ بہرحال خالد کی شاعری اسلام کے اس عہدِ انحطاط میں احیائے اسلام کی تحریک کا ادبی صُور ہے۔ ہم اگر حالی سے شاعری کے انقلاب کا جائزہ لیں تو شبلی، اکبر الہ آبادی سے گزرتے ہوئے ظفر علی خاں، اور محمد علی جوہر کی ذہنی فضا میں پرواز کرتے اقبال کے بحرِ بیکراں تک پہنچ جاتے۔ پھر ایکا ایکی کنارے پر پہنچ کر ترقی پسند شاعری کے دشت و جبل کا نظارہ کرتے، فیض احمد فیض اس کے نمائندہ ہیں۔

خالد کا مقام یہ ہے کہ اُنھوں نے گم شدہ کی تلاش میں قرنا پھونکا اور ریگ زاروں میں لالہ زاروں کا نقشہ جمایا ہے۔

احسان دانش: خالد کی شاعرانہ عظمت سے انکار ممکن نہیں۔ صرف وہی لوگ ماتھے پر شکن ڈال سکتے ہیں جو ان کے مطالب کی پہنائی سے ناواقف ہیں۔ سوال ہے کہ ان کی تحریک عام ہو سکتی ہے؟

شورش کاشمیری: سوال اُن کی تحریک کا نہیں، سوال خود اسلام کا ہے کہ اُس کی حلقہ بگوش ملت جو پاکستان میں آباد ہے، اسلام کی طرف لوٹتی ہے یا نہیں؟ اگر ہمارا معاشرہ اسلام کے سانچہ میں ڈھلا اور ہم نے اسلام کی تہذیب و تمدن اور زبان و بیان کو قبول کیا تو لازماً خالد کی تحریک بارآور ہوگی۔

نشاط عارفی: جوش و خالد میں کوئی مطابقت ہے؟

شورش کاشمیری: میرا خیال ہے آپ کا سوال صحیح نہیں۔ جوش و خالد، دو متضاد شاعر ہیں۔ جہاں تک شاعرانہ شکوہ اور زبان کے علو کا تعلق ہے۔ دونوں اپنے مطالب کے دوائر میں ان سے مالا مال ہیں۔ لیکن دونوں کے افکار میں بُعد المشرقین ہے۔ جوش کے عظیم شاعر ہونے میں شُبہ نہیں۔ فی الواقعہ زبان اُن کی لونڈی ہے۔ لیکن وہ ارتداد کے اور خالد جہاد کے شاعر ہیں۔ البتہ جوش کہن سال ہیں اور خالد جواں سال۔ خالد کا سفر اب شروع ہوا ہے۔ جوش اپنا سفر ختم کر کے شاعری میں الفاظ کا گلی ڈنڈا کھیل رہے ہیں۔ المختصر دونوں کے راستے منزل اور ذوق میں بہت بڑا فاصلہ ہے اور ان میں مطابقت کا سوال معنوی اعتبار سے غلط ہے۔

حیا سندیلوی: خالد کی شاعری جدید شاعری کے انحطاط کا ردِّ عمل نہیں؟

شورش کاشمیری: آپ کا سوال ذو معنی ہے۔

جیاسندیلوی : میرا سوال ہے کہ جدید شاعری جس نے آپ کی رائے کے مطابق بدعت کو جدّت کا نام دیا اور ایک شعلۂ مستعجل کی طرح ٹھنڈی ہو گئی۔ کیا خالد کی شاعری اُسی کا ردِّ عمل نہیں؟

شورش کاشمیری : یہ ایک سوال نہیں دو سوال ہیں اور ان میں باہمی ربط نہیں۔

ایک سوال ہے کہ جدید شاعری محض بدعت تھی جو مغربی افکار کی بدولت پیدا ہوئی۔ لیکن ہمارے معاشرے کی نفسیات سے اُلٹ ہونے کے باعث مر گئی۔

دوسرا سوال ہے کہ خالد کی شاعری گویا اُس کے ردِّ عمل سے پیدا ہوئی ہے۔

جہاں تک جدید شاعری کے مغربی مزاج اور نظم آزاد و نظم معریٰ کا تعلق ہے فی الواقع ہمارے معاشرے میں معنوی اعتبار سے مسترد ہو چکی ہے اور اس کا تعلق ہمارے آہنگ کے ساتھ نہیں تھا۔ اس کے مطالب بھی ہمارے لیے بڑی حد تک اجنبی تھے۔ البتہ خالد کی شاعری اُس کا ردِّ عمل نہیں بلکہ معاشرے کی آواز ہے۔ ہم ان کی شاعری سے متعلق کہہ سکتے ہیں کہ وہ تنقیدِ حیات ہے، تفسیرِ حیات ہے۔ تطہیرِ حیات ہے اور تصویرِ حیات ہے۔ خالد جدید شاعری کے اندھیروں سے روک کر ہمیں ماضی کے اُجالوں کی طرف لوٹاتے ہیں۔ گو ان کا مجموعہ کلام گویا قمِ باذنی ہے۔

احسان دانش

عظمتِ پنجاب

نازشِ شعر و ادب ہے، عظمتِ پنجاب ہے
اس کی ہستی سربسر مہر و وفا کا باب ہے

اس کی پیشانی سے اس کے دل کے جلوے آشکار
اس کے الفاظ و معانی ہیں بہار اندر بہار

صاحبِ فکر و قلم بھی، صاحبِ اخلاق بھی
زندگی میں سوز بھی، ادراک میں اعماق بھی

ہے بلند اس کا تخیّل اور جواں اس کا قلم
ہر زمینِ شعر میں دیکھا رواں اس کا قلم

صرفِ گردش اس کے ابلاغِ جنوں کا جام ہے
ہے یہ خوش کردار، اس کی روح میں اسلام ہے

اپنے کارِ منصبی میں کامگار و کامیاب
شاعری ہے اس کی صنعت، اس کا سرمایہ کتاب

ایک اعلیٰ منصرم ہے، ایک دانا آدمی!
مدّتوں میں یہ زمیں دیتی ہے ایسا آدمی!

حکیم محمد سعید

عبدالعزیز خالد

میں اپنے تئیں نہ شاعر سمجھتا ہوں نہ ادیب لیکن پاکستان کی بیشتر علمی و ادبی شخصیتوں سے قربت و نسبت کا فخر مجھے ضرور حاصل ہے اس نسبت کی بنا پر جناب عبدالعزیز خالد کے نام سے میں پوری طرح متعارف ہوں۔ اگرچہ اپنی مختلف النوع مصروفیتوں کے باعث مجھے زیادہ تفصیل کے ساتھ ان کی شاعری کے مطالعے کے مواقع نہیں ملے۔ پھر بھی جتنا کچھ میری نظر سے گذر چکا ہے اس سے مجھے ان کے پیرایۂ اظہار، فکری زاویے اور ذہنی موڈ کا بڑی حد تک سراغ مل جاتا ہے۔ ان کے کلام کا سب سے بڑا صحت مندانہ پہلو یہ ہے کہ انہوں نے اُردو کے مزاج میں عربی الفاظ کو قبول کرنے اور ان میں اپنا دائرہ کار وسیع کرنے کا شعور پیدا کیا اور دونوں زبانوں کی لفظی ہم آہنگی اور معنوی رشتہ داری کو نئی شعری بنیادوں پر استوار کرنے کا ایک ذریعہ تلاش کیا۔ چونکہ جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے اُردو ادب میں اس نوع کی یہ پہلی کوشش ہے۔ اس لئے میں اسے اُن کی ذہنی اُپج متجسّانہ جذبے اور فکری اپروچ Approach سے تعبیر کروں گا۔

اُردو زبان میں عام طور پر نظموں، غزلوں اور دوسرے منظوم سرمائے کے لئے الفاظ کا ایک مانوس گنا چنا ذخیرہ مقرر ہوتا ہے اور فنکار شاعر اس ذخیرے سے اپنی شاعری کی تکمیل کرتے اور انہی آئینوں کو نئے انداز سے صیقل کر کے اپنی بزم شعر آراستہ کرتے ہیں لیکن عبدالعزیز خالد کی شاعری کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ الفاظ کے اس گنے چنے ذخیرے پر تکیہ نہیں کرتے بلکہ ان الفاظ کو بھی مانوس بنا کر ان کا جائز حق دلواتے ہیں، جو اب تک گراں، ثقیل اور غیر مانوس سمجھ کر نظر انداز ہوتے رہے۔ ہمارے شعراء کی ایک بڑی تعداد فن کو فکر پر ترجیح دیتی ہے اور الفاظ کے افسوں پر فکر کی عمارت تعمیر کرتی ہے لیکن ان کے ہاں فکر کو اوّلین حیثیت حاصل ہے اور فن کو ثانوی جہاں تک فن کے برتنے کا سوال ہے یہ ایسی ایسی پُر پیچ راہوں سے بے خطر گذر جاتے ہیں جہاں تک اچھے اچھے "جی داروں" کے حوصلے پست ..... ہو سکتے ہیں، دوسروں کے ہاں فکر کی نازک مزاجی کی مناسبت سے حسین، جمیل اور نازک مزاج لفظ تلاش کئے جاتے ہیں لیکن عبدالعزیز خالد کے ہاں الفاظ کے اوپری بناؤ سنگھار سے کہیں زیادہ مقصد و معانی کی آراستگی پر توجہ دی جاتی ہے غالباً اپنی علمی پرکھ اور مقصدی اُنا کی بنا پر وہ اس سلسلے میں "پُر اعتماد" ہوتے ہیں کہ وہ جس باوزن مفہوم کو پیش کرنا چاہتے ہیں الفاظ اس کی فکر کا بوجھ سہار سکتے ہیں۔

یہ صرف خوش فہمی نہیں۔ ان کے
کلام سے اس اعتماد کی بے شمار علامتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ درحقیقت ہلکے پھلکے، سبک اندام اور تنگ قبا رکھنے والے الفاظ معنویت کی گمبھیرتا فکر کے پھیلاؤ اور فن کی مردانگی کو برداشت نہیں کر سکتے اس لئے حکیمانہ نقطۂ نظر سے ایک شاعر کو تخیل سازی کی خلاقی کے ساتھ الفاظ و تراکیب سازی کے ہنر سے بھی واقف ہونا چاہیئے۔ عبدالعزیز خالد کی شاعری بنیادی طور پر اسلامی نظریۂ حیات کا پرچار کرتی ہے اور چونکہ اس مقصد کو کمزور اور بے جان الفاظ کی لے اور موسیقی کے بل بوتے پر زندہ نہیں رکھا جا سکتا۔ اس لئے وہ الفاظ و تراکیب کے انتخاب میں نظری بصارت کے علاوہ ذہنی بصیرت سے بھی کام لیتے ہیں اور ظاہری حسن و جمال پر باطنی خوبیوں کو ترجیح دیتے ہیں۔ وہ ایک ایسا قالب تراشتے ہیں جس پر اسلامی پیرہن پوری طرح فٹ ہو سکے۔ وہ کھوکھلے الفاظ سے فکر کی آب و تاب مستعار نہیں لیتے بلکہ اُردو سے روٹھے ہوئے الفاظ کو فکر کی آب و تاب دے کر نئے ادبی افق پر چمکاتے ہیں۔ ان کی یہ کوششیں احیاء پرستی Revivalism کے شعور کو جنم دیتی ہے۔ ان کے کلام کو پڑھتے وقت عربی شعرا کا ماضی حال کا جامہ پہن کر ہمارے سامنے آ کھڑا ہوتا ہے اور ہم اپنے آپ کو غور و فکر کے ایک جہانِ دگر میں محسوس کرتے ہیں۔
اسلامیات پر ان کی نگاہ بہت تیز اور ان کا شغف بہت گہرا ہے۔ عبدالعزیز خالد صاحب کو میں نے دور سے بھی دیکھا ہے اور قریب سے بھی اور ان کی کتابوں کے ذریعہ سے ان کے اندر جھانکا بھی ہے وہ بڑے متین اور سنجیدہ ہیں۔ پاک دل ہیں۔ ان کی طبیعت میں الجھاؤ نہیں ہے۔ تصنع نہیں ہے۔ بڑے سادہ ہیں۔ صاف ستھرے ہیں مسلمان ہیں۔ غرض ایک بڑے اچھے انسان ہیں یہی سبب ہے کہ ان کا کلام "ہنگامی تقریبوں" اور "وقتی محفلوں" میں اپنی مقصدیت کا رمز نہیں کھوتا۔ فکر و دانش کی ترازو میں تلنے کے بعد اس کی کیفیت و کمیت Quality and Quantity کی صحیح اقدار ہمارے سامنے آتی ہیں۔

جہاں تک میرا "اندازہ" ہے اس کوچے میں ان کی رہ نوردی کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا لیکن جہاں تک میرے یقین کا تعلق ہے۔ وہ ان مرحلوں کو بہت کم عرصے میں بہت پیچھے چھوڑ گئے ہیں جن مرحلوں میں لوگ اپنے سفر کا بہت بڑا حصہ طے کر کے بھی بہت پیچھے رہ جاتے ہیں۔ ان کی جو کتابیں اب تک سامنے آئی ہیں وہ اس یقین کا ناقابلِ تردید ثبوت ہیں اور اس کی بنا پر بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے اردو ادب کے سرمائے میں بڑا قابلِ قدر اضافہ کیا ہے۔

عشرت رحمانی

خالد کی نعتیہ شاعری

عبدالعزیز خالد کی شاعری کا خارجی پیکر ان کے داخلی تصوّرات کے مطابق ہے، اس لیے اس کے مطالعے سے وہی تاثّر پیدا ہوتا ہے جو ان کو مطلوب ہے، خالد صاحب کی شاعری میں حسن کی ایک خاص شان پائی جاتی ہے، لیکن اس حسن میں عمومیت کا انداز نہیں بلکہ بلاغت کی ہر کامیاب پُرجلال جلالی ادا جلوہ گر ہے۔ اس سے دل و دماغ پر کیف و سرور کے ساتھ رعب کا تاثر چھا جاتا ہے، خالد صاحب کے ذہن کا یہ خاصہ ہے کہ وہ متجانس اجزا سے اپنی غزل یا نظم مرتّب نہیں کرتے۔ یعنی وہ علیٰحدہ علیٰحدہ عناصر کا جائزہ لیتے اور ان کو رشتۂ وحدت میں پرو دیتے ہیں، ان کی شاعری میں موسیقی کا عنصر، رجحان، موضوع اور مضمون کی نوعیت کے مطابق ہے۔ وہ مطلوبہ موسیقی اور سحر آفرین نغمگی و غنائیت کے لیے بحر و صنف کا موزوں انتخاب کرتے ہیں اور بحر و صنف یا ہیئت دونوں کی ترکیب سے عجیب اثر پیدا کرتے ہیں۔ ان کے کلام میں تمام موسیقی ولولہ خیز اور تفکّر انگیز ہے مگر حریت افزائی کی بھی کمی نہیں۔ جوش انگیز غنائیت کے لیے لمبی بحر اور مصرعوں اور لفظوں کی موزونیت اور بے ساختہ صنعت گری سے بڑا کام لیا ہے۔ شخصی نشاط کی لَے اور ہے اور اجتماعی ولولہ انگیز و کیف آور لَے اور اسی طرح شخصی داخلی نشاط کی موسیقی کچھ اور انداز کی ہے۔

ان کے کلام کی سب سے بڑی خوبی اور خصوصیت یہ ہے کہ وہ بقول اقبال اپنی غزل یا نظم میں اپنے پیش نظر اس حقیقت کا اظہار کرتے نظر آتے ہیں کہ

ع اوروں کا ہے پیام اور میرا پیام اور ہے

اور اس قول کو بھی سچا کر ثابت کرتے ہیں کہ

ع عشق کے دردمند کا طرزِ کلام اور ہے

یعنی خالد صاحب کی شاعری میں امر واقعہ اور حقائق سے کہیں گریز نہیں پایا جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی شاعری میں جذباتی حقائق اور سماجی نیز دینی و علمی اور عقلی احوال اس طرح ایک دوسرے سے آمیز ہو گئے ہیں۔ شاعری اور فلسفہ بلکہ شاعری اور سائنس کے درمیانی فاصلے مٹ گئے ہیں۔ علاوہ ازیں خالد کا فن محض جمالیاتی مظاہرۂ ذہنی نہیں بلکہ ایک وسیلۂ تسخیر و ارتقا، بھی ہے جس کی مدد سے شاعر اپنی جذباتی تسکین ہی نہیں چاہتا بلکہ اپنے داخلی امکانات کی تبلیغ و توسیع بھی کرتا جاتا ہے۔

اس لحاظ سے خالد کی شاعری صرف حقیقت گوئی، موسیقی یا بلاغت و فصاحت نہیں بلکہ ایک انقلاب آفریں فکری پیش قدمی اور دعوت و تبلیغ بھی ہے اور اس کا دائرہ شخصی ذات و صفات سے گزر کر اجتماعی حیات و کائنات حتّٰی کہ خالق و مالک حیات و کائنات اور محبوبِ ربِّ کائنات کی مدح و ثنا تک جا پہنچتا ہے۔

اس سلسلے میں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ خالد کا فن اس ادبی روایت کا وارث ہے جس کے دورِ حاضرہ میں خالد سے پیشتر ایک نمائندے علامہ اقبال بھی تسلیم کیے جاتے ہیں۔ مگر عظیم نمائندگانِ سلف میں سنائیؒ۔ عطارؒ۔ رومیؒ اور جامیؒ تھے۔ ان اکابرِ ادب میں خصوصیت سے عطارؒ اور رومیؒ وہ حضرات کرام ہیں جن کی شاعری بے لگام تخیّل اور محض ہیجانِ جذبات کی غلام نہیں، بلکہ روحانی اور فکری و علمی تجربات کی بھی آئینہ دار ہے۔

خالد صاحب کی اسلامی شاعری کے بارے میں راقم محترم و مکرّم اُستادی الافادی حضرت علامہ عبدالعزیز میمنؒ کی رائے عالی کو مسلّم الثبوت حرفِ آخر تسلیم کرتا ہے۔ ان کا یہ ارشاد یقیناً بجا ہے کہ:

> "عبدالعزیز خالد، میں یہ نہیں کہوں گا کہ اس دور کے ممتاز و بے مثل اسلامی شاعر ہیں بلکہ پوری اُردو شاعری کی تاریخ میں مجھے کوئی اسلامیات اور عربی کا اتنا ماہر اور باخبر ادیب و شاعر معلوم نہیں۔"

خالد صاحب کی ہر نعت میں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ کی شانِ مبارک کے فضائل کریمہ کا ذکر اور نذرِ عقیدت نہایت فصاحت و بلاغت کے اسلوب میں موجود نظر آتی ہے اور حضور علیہ السّلام کے اوصافِ مبارکہ کے سلسلے میں متعدّد مقامات پر نعتیہ شعروں میں آیاتِ قرآنی کا اختصار و جامعیت کے ساتھ ذکر کیا ہے چونکہ خالد کو عربی، فارسی اور اُردو وغیرہ متعدّد زبانوں پر کماحقہٗ عبور حاصل ہے اور زبان و بیان پر کامل قدرت ہے اس کے ساتھ قرآن کریم اور احادیثِ نبوی کا بھی گہرا مطالعہ ہے۔ اس لیے علمی بصیرت کی روشنی میں ان نعتوں میں سے اُنھوں نے بدیہی طور پر قرآن و سنت کی مختصر تفسیر بیان کر دی ہے۔ اس لحاظ سے میری متذکرہ بالا گزارش کی تصدیق ہوتی ہے کہ ان کی نعتیہ شاعری میں حضرات عطارؒ، رومیؒ اور جامیؒ کی روایت کی پیروی موجود نظر آتی ہے۔

جی چاہتا ہے کہ خالد کے ہر شعر کی تشریح کی جائے اور قرآنِ حکیم و سیرتِ طیبہ کے حوالے سے تفسیر بیان کر کے انھیں بار بار خراجِ تحسین و داد پیش کیا جائے۔

بڑا شاعر، بڑا انسان

شبنم شکیل

بعض اوقات قدرت ایک ہی انسان میں بہت سی خوبیاں جمع کر دیتی ہے اور جب ایسا ہوتا ہے تو اس انسان کی شخصیت میں ایک عجب طرح کا سحر پیدا ہو جاتا ہے عبدالعزیز خالد بھی ایسے ہی افراد میں سے ہیں جنہیں قدرت نے بہت سی اچھی صفات سے بہت فیاضی سے نوازا ہے وہ ایک بڑے انسان بڑے ادیب اور بڑے شاعر ہیں۔ ویسے تو عالم کا لفظ بہت سے لوگوں کے لیے استعمال کیا جاتا ہے لیکن اگر عالم کی اصطلاح کو صحیح معنوں میں استعمال کرنا ہو تو پاکستان میں شاید سب سے موزوں انسان عبدالعزیز خالد ہی ہوں گے خالد نے اپنی پوری زندگی لکھنے پڑھنے پر گزاری ہے اور وہ بھی یوں کہ ساتھ ہی وہ حکومت میں ایک اہم عہدے پر بھی فائز رہے لیکن انہیں وقت کی کمی کا گلہ کرتے کبھی نہیں سنا گیا۔ شاید وہ ان چند انسانوں سے ہیں جو وقت کا صحیح مصرف جانتے ہیں وقت کا شکوہ تو شاید مجھ جیسے کم مایہ لوگ کرتے ہیں جنہیں اپنے نصب العین کا تعین کرنے میں دقت ہوتی ہے خالد صاحب نے اپنی زندگی کا مشن "جاننا" اور پھر اسے لوگوں کو پہنچانا بنا رکھا ہے ادب، فلسفہ۔ مذہب تاریخ اور سائنس کے ہر اہم موضوع پر ان کا گہرا مطالعہ ہے۔ کتاب ان کی زندگی کا اوڑھنا بچھونا ہے کثرتِ مطالعہ نے ان کی شخصیت اور فن میں کشادگی اور وسعت پیدا کر دی ہے وہ نہ صرف ایک روشن خیال انسان ہیں بلکہ اب ایک روشن خیال ادیب اور شاعر بھی ہیں ان سے ملاقات کے بعد انسان کو اپنے ذہن کے کئی دریچے کھلتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ اور کئی گتھیاں سلجھتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ انتہائی صاف ذہن کے انسان ہیں اور کبھی کسی قسم کے ذہنی انتشار کا شکار نہیں ہوئے "جو ہے وہ ہے" اور جو نہیں ہے وہ نہیں ہے" یہی ہے ان کی مثبت سوچ کا رنگ۔ جو ان کی شاعری۔ نثر اور گفتگو سے جھلکتا ہے مثبت اور تعمیری سوچ یا فکر ہمیشہ دوسرے کو متاثر کرتی ہے۔ خاص طور پر آج کے اس ذہنی خلفشار کے دور کرنے میں جب ہم میں سے اکثر کو اپنے لیے صحیح راہ منتخب کرنے میں دقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے یہ ایسا دور ہے جہاں پھول پوری طرح سے پھول نہیں لگتے اور کانٹے کانٹے معلوم نہیں ہوتے ہر جذبہ گڈمڈ ہو کر رہ گیا ہے ایسے دور میں خالد صاحب کی تعمیری اور مثبت سوچ کسوٹی پر پرکھا ہوا سونا معلوم ہوتی ہے اور وہ اپنے انداز فکر سے دوسرے کو ایسے متاثر کرتے ہیں جیسے سورج کی شعاعیں ذی روح کو لیکن ان کی جو خوبی دل پر گہرا اثر کرتی ہے وہ اس تمام علم کے باوجود اُن کی انکساری ہے اکثر دیکھا گیا ہے کہ صاحب علم میں ایک خاص قسم کا تفاخر آجاتا ہے اور وہ اپنے آپ کو دوسروں سے ذرا بلند سمجھنے لگتا ہے مگر خالد صاحب کی ذات ایسے کسی کمپلکس کا شکار نہیں ہے اُن کی شخصیت کھلم کھلا اس صداقت کا اظہار کرتی نظر آتی ہے کہ "علم نے مجھے یہ بتایا کہ میں کچھ نہیں جانتا" علم اور انکساری گویا ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔

کامل القادری

شرفِ قرآن بزبانِ خالد

قرآن کلامِ الٰہی ہے،
قدیم ہے کہ نطقِ خدا ہے،
کتاب مبین ہے، امرِ حق ہے
سرچشمۂ ہدایت ہے،
دینِ الٰہی کا رَقِّ منشور ہے۔

ادبی محاسن کے لحاظ سے منفرد، بے نظیر، بے مثیل و بے بدل ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے پیغمبر، اس بات کا اعلان کردے کہ اگر تمام انسان اور جن اکٹھے ہو کر چاہیں کہ قرآن کی مانند کوئی کام پیش کردیں تو کبھی پیش نہیں کر سکیں گے[1] اگرچہ ان میں سے ہر ایک دوسرے کا مددگار کیوں نہ ہو۔ قرآن حکیم کے پچپن صفاتی نام ہیں، جن میں سے بعض یہ ہیں:

فرقان، کتاب، مبین، کلام، نور، حکمت، ذکر، جمیل، صراطِ مستقیم، ابلاغ، المجید، العزیز، المہیمن قول، تنزیل، بیان، تذکرہ، صدق، العروۃ الوثقیٰ، ہدیٰ۔

ان میں قرآن علَم ہے۔ قرآن بطریق وحی نازل ہوا لہٰذا اسے "وحی اللہ" بھی کہتے ہیں۔

لفظ وحی کے لغوی معنی مخفی طور پر خبر دینا ہیں۔ وحی "اشارہ" اور "الہام" کے معنوں میں بھی مستعمل ہوا ہے۔ اصطلاحِ شریعت میں وحی وہ کلامِ ربانی ہے جو انبیاء کرام پر نازل ہوا ہو۔

انبیاء کرام پر تین طریقوں سے وحی نازل ہوا کرتی تھی۔ اوّل باری تعالیٰ کا فرمان براہِ راست اپنے کانوں سے سننا۔ دوم فرشتے کی وساطت سے، سوم قلب پر وحی کا القاء ہونا جیسا کہ حضرتِ داؤد پر اسی طرح سے وحی آیا کرتی تھی۔ انجیل، زبور، توریت اور تمام مصاحفِ سماویہ وحی الٰہی ہیں۔

---

[1] ۔ قرآنِ حکیم ۱۷ : ۸۸